بے گھاٹ کی ناؤ

بے گھاٹ کی ناؤ

(افسانے)

نور شاہ

- - - - -

باراول .... ایک ہزار

قیمت ..

کشمیر پبلیشرز - جموں (توی)

انتساب

اُن بیگانوں کے نام

جنہوں نے مجھے تحریک بخشی!

اُن اپنوں کے نام

جنہوں نے تحریروں سے زیادہ میری ذات کو اُچھالا!!

فہرست

پیش لفظ

۱- گلاب کا پھول

۲- زعفران کی لالی

۳- پتھر کا دل

۴- نلنی

۵- ایک خط ایک خواہش

۶- میری آرزو تیری تمنا

۷- بن برسے بادل

۸- دُھندلے نقش

۹- گلُ خان

۱۰- بے گھاٹ کی ناؤ

پیش لفظ

نور شاہ (شاہدہ شیریں) ایک پھول کی مانند افسانہ نگاری کے گلشن میں کھلا اور کھلتے ہی اپنے تعطّر اور لطافت سے دوسروں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ ایک میں دو وجود، دو روحیں، جو گلاب کے پھول میں سمٹ کر اردو ادب میں نمایاں ہوئیں۔ شاہدہ شیریں نور شاہ کا قلمی نام ہے۔ اِس نام کو اپنانے میں کون سی مصلحت ہے۔ یہ تو نور ہی بہتر جانتا ہوگا کہ اُسی کے نورانی تخیّل کا پرتو ہے۔ ہو سکتا ہے۔ نسوانی خدوخال اور چال ڈھال کا عکس جمیل آئینے میں دیکھا ہو اور اُس میں اپنے خیالوں کی محبوبہ کا سیمیں جسم منعکس پایا ہو۔ کچھ بھی ہو۔ لیکن نام کی مناسبت برحق ہے کہ ظاہر و باطن کی نفسیاتی باریکیوں کی حامل ہے۔ قریبی احباب کا کہنا ہے کہ اِس اپنائیت کا ایک گہرے المیہ سے تعلق ہے اور

شاہدہ شیریں نام سے نوُر کے ماضی کی چند تلخ چند شیریں یادیں وابستہ ہیں۔ جن کی بدولت اندھیری کھو کھلی فضاؤں میں ایک متحیر سوالیہ نشان بن کر رہ گیا۔ خلاؤں میں جھانکنے والی ایک ایسی نگاہِ تجسّس جو ماضی کے کھنڈروں میں ہر وقت ہر گھڑی کسی گمُشدہ لمحے کی تلاش میں منہمک رہتی ہے۔

گلُ پوش سرسبز و شاداب وادی نے اب تک اُردو ادب کی پُرخار راہ میں ہمیں رنگا رنگ پھولوں سے نوازا ہے۔ اور اُن پھولوں میں نوُر شاہ کی صورت میں ایک اور حسین نکہت ریز گلُ کا اضافہ ہوا ہے۔ نوُر زعفراں زار وادی کی ایک دلنشین کنُج میں سری نگر کے متوسط طبقے میں پیدا ہوا۔ وہیں پرورش و پرداخت ہوئی۔ احساسات میں جو زخم خوردہ دلوں کی دھڑکنیں ملتی ہیں۔ اندازِ بیان میں جو شگفتگی رچاؤ اور موسیقی ہے۔ وہ کچھ تو حیات پرور پہاڑی وادیوں کی عظمت و جلال کی دین ہیں اور کچھ اپنے ماحول اور طبقے کی رہینِ منت۔ نوُر کا تعلق براہِ راست محکمہ تعلیمِ نسواں سے رہا ہے۔ اس لئے محکمانہ ماحول کی نسائیت کردار و گفتار اور حرکات و سکنات میں رچ بس چکی ہے۔ یہاں تک کہ تحریر میں نسائیت کا عنصر غالب ہے۔ ایسے ماحول میں جہاں بہت

کچھ پایا۔ وہاں بہت کچھ کھویا بھی۔ پانے کا تعلق شعور سے تھا۔ کھونے کا تعلق دل سے۔ وقت کے ساتھ ماحول کی چھاپ گہری ہوتی گئی۔ تو دل کا زخم ناسور بنتا گیا۔ حتّٰی کہ نُور شاہؔ سے شاہدہ شیریں ہو گیا۔ جب کوئی جذباتی اور رقیق القلب اپنی ذات اپنا غم اپنا احساس شعوری اور غیر شعوری طور پر عمر کے مخصوص ایام میں، اپنی دیکھی یا ان دیکھی محبوبہ کے وجود میں مدغم کر دیتا ہے اور یوں اپنی جستجو کی تکمیل کر لیتا ہے۔ تو وہ میراجی بن جاتا ہے۔ شاہدہ شیریں بن جاتا ہے اور اپنی مجروح تمناؤں کی ساری تلخیاں اور محرومیاں اپنے دکھتے ہوئے سینے میں چھپا کر، بچی کھچی خوشیاں غیروں میں لٹا کر، ایک اجنبی سی مسرت ایک انوکھی سی تسکین حاصل کرتا ہے۔

نُور شاہؔ سے میرا تعارف ایک خط سے ہوا۔ جو میرے ایک افسانے سے متعلق تھا۔ کہیں تو ارد تھا یا موضوع ملتا جلتا تھا۔ خط کی تحریر میں تناؤ اور تیکھا پن تھا۔ تنقید اور توصیف کے ملے جلے جملے لئے خطوط تو اپنے محبوب مدّاحوں سے ملتے ہی رہتے ہیں۔ ہر خط کا جواب دینا اپنا فرضِ اوّلین سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ میرے لئے یہ رشتہ مقدس اور اہم ہے۔ طرزِ تخاطب مختلف سہی لیکن ایسے خطوط کا جذبہ ایک ہوتا ہے۔ کوئی بھائی بن کر لکھتا ہے۔ تو کوئی

.ہن یا محبوبہ کا رُوپ دھارن کر کے۔ اندازِ تحریر اور طرزِ تخاطب کی نوک پلک سامنے رکھ کر حسبِ ضرورت مختصر یا مفصل جواب دیتا ہوں۔ چوں کہ اپنے کشمیر سے اپنی نوعیت کا پہلا خط تھا۔ جس میں محبوبانہ شوخیاں اور مہربان محبت کا اظہار تھا اور اخلاقی جرأت کا ثبوت مانگا گیا تھا اور وہ بھی زوردار الفاظ میں۔ لہٰذا اخلاقی جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے تحریر کیا —— '.... آپ کے مطالعہ اور مشاہدہ کی قدر کرتا ہوں۔ ایک بات یاد رکھیے کہ شعر یا افسانے میں مفہوم یا پلاٹ کا ٹکراؤ ہو سکتا ہے۔ لیکن اُس کا مطلب خدارا یہ کبھی نہ لیجیے کہ شاعر یا افسانہ نگار نے چوری کی ہے کیونکہ چھوٹے بڑے مُستند فنکار کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ قارئین کا حلقہ وسیع ہے اور پُختہ شعور اور بالغ نظر بھی .... '

میرے جواب نے سلسلۂ خط و کتابت کی بُنیاد ڈالی اور کشمیر کے ناطے خط و کتابت جاری رہی۔ نُور نے میرے افسانوں اور ناولوں کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا تھا۔ مجھ سے بے حد متأثر دکھائی دیتا تھا۔ یکے بعد دیگرے تین چار خطوط پڑھنے کے بعد ایک بات مجھے محسوس ہوئی کہ جہاں تحریر میں سُتھرا پن ہے۔ نکھری سنوری ہوئی زبان ہے۔ ایک رچا ہوا انداز

بیان ہے۔ وہاں جواں فکری بھی ہے اور دُور نظری بھی اور مشاہدہ زندگی و مطالعہ نفس گہرا ہے۔ نوعمر ہوتے ہوئے بھی نوعمری زندگی کے سنگین حادثات سے انتہائی پختہ ہو چکی ہے۔ خطوط کی تحریر میں جو چُبھن تھی۔ تڑپ اور کُرید تھی۔ اُس میں ایک کہانی کار کی تشکیل پنہاں تھی۔ جو کسی وقت بھی عالم وجود میں آسکتا تھا۔ عالم وجود میں آنے سے پہلے ہی جیسے کسی ایسے راہنما کی تلاش تھی۔ جو مناسب وقت پر اُس ڈگر پر چھوڑ دے۔ جہاں سے اپنے سہارے قدم بقدم چلتے بڑھتے اپنی اُس منزل کو پالے۔ جو مضطرب خیالوں میں ابھی سے منہمک رہی تھی۔ راہنما ملا یا نہیں۔ لیکن حالات ہموار اور سازگار ملے اور آج وہی ڈرا سہما سا کہانی کار لگن و محنت اور جہدِ پیہم و عزمِ مستحکم کے سہارے بے گھاٹ کی ناؤ لئے اپنی منزل کی دہلیز پر کھڑا نازاں و شاداں نگاہوں سے اُن پُرخار پیچیدہ راہوں کو پہچان رہا ہے۔ جنہوں نے اپنے کانٹوں سے اُس کے پاؤں چھلنی کئے۔ لیکن قدموں کو بلندیوں اور وسعتوں کی سمت بڑھنے کا راستہ اور حوصلہ بخشا۔ شاہدہ شیریں ہو یا نُور شاہ یا کوئی اور، آخر نام میں کیا رکھا ہے، موجودہ افراتفری اور بے راہ روی کے دَور میں غیر معمولی ذہانت اور شعوری پختگی کے بل بُوتے پر ہی اپنا راستہ ہموار کر سکتا ہے۔ نُور شاہ نے ایک قلیل عرصہ میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے زور پر اپنے آپ کو منوایا اور آج نئے اُبھرنے والے افسانہ نگاروں میں اپنے مخصوص رنگ میں رنگے ہوئے ایک نمایاں

مقام پر پہنچ چکا ہے۔ اور اُس کا شمار نوجوان فنکاروں میں ہونے لگا ہے جن کے قلم میں بہاؤ اور شعور میں افسانہ نگاری کا صحت مند رجحان موجود ہے۔ جو نئے لکھنے والوں میں آتے ہیں۔ لیکن جن کی فنی پختگی اُن کے نئے پن کو مشکوک بناتی ہے

بے گھاٹ کی ناؤ کے افسانوں کی تخلیق و ترتیب کی تہ میں ایک کہانی ہے۔ نگاہِ تجسس کی کہانی۔ جس کا محور آج کا انسان ہے۔ انسانی زندگی کے سوز و ساز کا زیر و بم ہے۔ مجبوریوں اور ناکامیوں کی خلش ہے اور رستے ہوئے ناسوروں کا ذکر بھی کہ اسی محور کے گرد آج کی دُنیا آج کا ماحول اور آج کا سماج گھوم رہا ہے چھوٹے بڑے غریب امیر کی تفریق پیدا کر رہا ہے اپنی بقا کے لئے زندہ انسانوں کو پیس رہا ہے۔ اِن افسانوں میں نور نے سماج کے غیر انسانی توازن پر آنسو بہائے ہیں جس میں غریب و نادار کا کوئی وزن نہیں کوئی قیمت نہیں۔ اُس نے شعوری طور پر انسانی ادب کو اپنایا ہے۔ جس میں اُس کے آنسوؤں کی مسکراہٹ اور خون کی سُرخی شامل ہے کہ خود بھی اُنہی انسانوں میں سے ہے۔ اُنہی کا ہے۔ افسانوں کا غم و اندوہ حقیقت سے اتنا قریب ہے کہ مصنف کے تجربات ہمیں اپنے تجربات معلوم ہوتے ہیں۔ نور نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے اور فنکارانہ انداز سے اُس کی عکاسی کی ہے۔ جو کچھ لکھا ہے۔ ارد گرد کے حالات کا خوردبین نگاہوں سے مطالعہ کر کے لکھا ہے اور انسانی دل کی تمام کیفیات کو اپنی کہانیوں میں

سمویا ہے۔ اِسی لیئے یہ کہانیاں جہاں انسانی زندگی کے نشیب و فراز کا آئینہ ہیں وہاں اِن میں زندگی کی ہولناکیوں اور مسرت آفرینیوں کی جھلک بھی نمایاں ہے۔

نُورؔ کے افسانوں میں شعور و فکر کی اکثر مثالیں مِلتی ہیں۔ زبان اور اسلوب فنکارانہ اور شاعرانہ ہے کہ دھیمے سُریلے سُروں میں اپنی بات کہنے کا قائل ہے۔ تحریر میں جہاں شگفتگی اور بے تکلفی ہے۔ وہاں غضب کی روانی اور بے ساختگی بھی ہے۔ پہاڑی ندی جیسا تسلسل اور رچاؤ ہے چنچلتا اور گہرائی ہے۔ نُورؔ کے یہ افسانے شدید احساس کے مرہونِ منت ہیں۔ ایک معمولی سا واقعہ بھی اُس کے ایک خوبصورت افسانے کا اساس بن جاتا ہے۔ اور انسان کے کردار حقیقی زندگی کے کردار معلوم ہوتے ہیں۔

نُورؔ انسانی نفسیات پر گہری نظر رکھتا ہے۔ پیشِ نظر مجموعہ کے افسانوں میں رومان کے پھول بھی ملیں گے اور مقصدیت کے کانٹے بھی کہ زندگی میں سوز و ساز قدم بقدم اور دوش بدوش ہیں۔ کہیں کہیں سماجی بے اعتدالی اور بے راہ روی پر دردمندی کے ساتھ طنز بھی کیا ہے۔ اُس کی نگاہیں ماحول کی پُر فریب سطح کو چیر کر تہہ میں حقیقت کو ڈھونڈتی ہیں اور کامیابی کے ساتھ مطلوبہ تاثر اُبھارتی ہیں۔

"بے گھاٹ کی ناؤ" کے افسانوں پر علیحدہ علیحدہ اظہارِ خیال مقصود نہیں۔ کیونکہ تمام افسانے ایک ہی معطر پھول کی مختلف بکھری ہوئی پتیاں ہیں۔ جن کا حقیقی رنگ اور تعطر مجموعی تاثر میں پنہاں ہیں۔ اُسی انداز سے اُنہیں سمیٹ کر نگاہوں کے سامنے اُجاگر کرنا ہے۔ کیونکہ مختلف کردار مشترکہ حرکت سے ایک ماحول کو جنم دیتے ہیں۔

اور اُس رنگا رنگ ماحول میں ہی انسانی سماج کی رُوپ ریکھا دیکھی جا سکتی ہے۔ "بے گھاٹ کی ناؤ" کا مجموعی تاثر ہی ہمیں ان افسانوں کی دھڑکنوں کے قریب لے جا سکتا ہے۔ جنت نئے پرانے افسانہ نگاروں نے نئے کشمیر کی جو روپ ریکھا اپنی تخلیقات میں اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔ اُس میں جاگیردارانہ ماضی کی پرچھائیاں تو ہو سکتی ہیں۔ لیکن وہ آج کے نئے ماحول عوامی دور کی صحیح تصویر نہیں۔ خوش آئند مستقبل کی جھلک نہیں۔ میری خواہش ہے کہ نُور اپنی جنت کی مقدس اور پُر خلوص کہانیاں اپنے انداز میں لکھے اور اپنی زعفرانی دھرتی کے حقیقت افروز نقوش پیش کرے۔ جو نہایت ہی پاکیزہ حسین اور صحت مند ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ نُور شاہ اپنی دھرتی کے تابندہ ذروں کو نا اُمید نہیں کرے گا اور اُردو ادب میں اُس کی آمد نئے ادیبوں کے لئے راہ ہموار کرے گی۔ حوصلہ افزا پیغام لائے گی "بے گھاٹ کی ناؤ" نُور کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے اور ہر لحاظ سے کامیاب اور مکمل ہے۔ اگر اُس نے اپنی دھرتی کا دامن نہ چھوڑا اور اپنی کہانیوں کا خمیر اپنی مٹی سے ہی اُٹھاتا رہا۔ تو ایک دن اُس کا شمار اُن سر کردہ افسانہ نگاروں میں ہو گا۔ جو حقیقی معنوں میں کشمیر کے نمائندہ اور منفرد ادیب کہلانے کے مستحق ہیں۔ اپنے موہن یاور، حامدی کاشمیری، وید راہی اور پشکر ناتھ جیسے جموں و کشمیر کے اُردو افسانہ نگاروں کی صف میں نُور شاہ کی شمولیت قابلِ فخر اور باعث ستائش ہے۔ افسانہ نگاروں کی صف میں اُس کا خیر مقدم ہونا چاہئے۔

ٹھاکر پونچھی۔ نئی دہلی۔
۲۴-۴-۶۰

گلاب کا پھول

گلاب کا پھول

شام بابو کے کوٹ میں گلاب، کا پھول دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک بھولا بسرا منظر گھوم گیا۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

"دیکھئے بابوجی! گلاب کا پھول اپنے کوٹ میں نہ لگایا کریں —!"

اُس نے حیران ہو کر پوچھا — "کیوں مِٹھو میاں —؟!"

اب مِٹھو میاں کیا جواب دیتا۔ بس خاموش رہا۔ ویسے مجھے باتیں بنانا آتی ہیں۔ ویسے میں ہر بات کو سمجھتا ہوں۔ کیا ہوا اگر اَن پڑھ ہوں۔ ویسے ہوں تو ٹھیک اچھے کھاتے پیتے گھرانے کا نورِ چشم کیا ہوا جو اچھا گھرانہ نہ رہا۔ دیکھتے دیکھتے میرے جیسے اور بھی کئی فقیر ہو گئے۔ بھیڑا بن جانے سے خاندانی بو باس تو نہیں جاتی۔ کیا ہوا اگر میری شادی نہ ہوئی ہمارے خاندان کے مردوں نے تو تین تین شادیاں کی تھیں

زمین جائداد نہ رہی۔ سر پر اپنوں کا ہاتھ نہ رہا، تو کیا برسوں پرانی خاندانی وجاہت ملیامیٹ ہو گئی۔ پیار کی بھوک ختم ہو گئی۔ جوانی میں بڑھاپا آ سکتا ہے، لیکن وہ اندر کے پیار کی حس کو تو فنا نہیں کر سکتا۔ مٹھو میاں بننے سے میں بڈھا تو نہیں ہو گیا۔ اب تک کی زندگی میں بڑھاپے کا احساس مجھ میں صرف ایک بار جاگا تھا جب میں نیا نیا چپراسی بھرتی ہوا تھا۔ اور دفتر کی ایک خوبصورت اٹھارہ سی کلرک لڑکی نے مجھے مٹھو چاچا کہہ کر پکارا تھا۔

میں نے ترنگ میں آکر صاف صاف کہہ دیا تھا۔

"میرا نام مٹھو چاچا نہیں۔ چاچا بننے سے پہلے دو تین بچوں کا باپ بننا چاہتا ہوں اس لئے مجھے مٹھو رام کہہ کر پکاریے یا مٹھو میاں۔ حالانکہ میاں کا لقب بھی مجھے پسند نہیں۔ البتہ اگر چاہو تو مٹھو جی کہہ کر پکار سکتے ہو۔ ہاں مٹھو جی!"

لیکن یہ آخری فقرہ میں نے اس لڑکی سے نہیں کہا تھا۔ صرف اپنے من میں سوچا تھا۔ تب میں کچھ باتیں بابو لوگوں اور بابو چھوکریوں سے کہہ دیتا تھا۔ من میں سوچتا نہیں تھا۔ اور کچھ باتیں اپنے من میں سوچتا تھا۔ کہہ نہیں پاتا تھا۔ کچھ ایسی ہی بات تھی۔ اگر بابو مٹھو رام ہوتا تو دوسری بات تھی۔ لیکن مٹھو میاں ایک چپراسی کی خاکی وردی میں یہ سب کچھ بھلا کیسے زبان پر لاتا؟

خیر جانے دیجئے۔ بات شام بابو اور گلاب کے پھول کی تھی۔ میں اپنے اندر کے میاں مٹھو کی ٹیں ٹیں بیچ میں لے آیا۔ بیکار سی کھوکھلی ٹیں ٹیں!

کیوں جی۔ لڑکی کا قد پورے پانچ فٹ ہو۔ رنگ ہلکا گندمی ہو۔ آنکھیں مست ہرن اور رخسار گلابی گلابی۔ اور دانت سپید سپید۔ موتیوں جیسے۔ تو کیا اُسے خوب

صورت کہا جا سکتا ہے ؟! اگر ہنستے وقت اُس کے رخساروں میں ایک ہلکا سا گڑھا پڑ جائے۔ چلتے وقت انگ انگ رقص کرے۔ باتیں کرتے وقت کانسی کے کٹورے سے بجنے لگیں۔ تو کیا اُسے خوبصورت کہا جا سکتا ہے؟! رانی کی بات کر رہا ہوں۔ میرے پہلے دفتر میں کلرک تھی جہاں صرف دس بارہ چھوٹے بڑے بابو تھے۔ میرے نئے دفتر میں تو بہت زیادہ عملہ ہے۔ سب کے سب غریب ہیں۔ اپنی اپنی مجبوریوں میں اُلجھے رہتے ہیں۔ زمانہ ہی مہنگا ہو گیا ہے پہلے دفتر والی بات اب کہاں؟

ہاں تو شام بابو کے کوٹ میں گلاب کا پھول لگا دیکھا۔ تو پہلے دفتر کی ایک بھولی بسری یاد آگئی۔ وہ کمرہ یاد آگیا جس میں رانی بیٹھی تھی۔ بھولا بابو اور سعید بابو بیٹھتے تھے دفتر میں دو تین کمرے اور بھی تھے۔ ایک ہیڈ کلرک کاظمی صاحب کا کمرہ تھا۔ اور باقی دوسرے چھوٹے موٹے بابو لوگوں کے۔ لیکن زیادہ چہل پہل رانی ہی کے کمرے میں رہتی۔ ایسی چہل پہل جو صرف اشاروں اور سرگوشیوں کی پیداوار ہوتی ہے۔ زبانیں عموماً خاموش رہتیں۔ آنکھیں باتیں کرتیں۔ ایسی ہی چہل پہل میں ہر کوئی ایک دوسرے سے بے خبر اور بے نیاز رانی کو اپنانے کی کوشش میں تھا۔ ہر کوئی اس جستجو میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی تگ و دو میں تھا۔ کاظمی صاحب بھی اپنی ادھیڑ اور پلپلی سی عمر میں رانی کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ اُس کا قصور نہیں تھا۔ بیوی کے سوا اُسے کسی دوسری عورت کا قرب حاصل نہیں ہوا تھا۔ ہوا بھی کبھی ایسا حادثہ تو پسینے چھوٹ گئے۔ بیوی سامنے آگئی۔ کاظمی صاحب اپنی بیوی سے بہت ڈرتا تھا جس طرح ایسی عمر میں عام طور پر مرد ڈرتے ہیں۔ لیکن رانی کی اور بات تھی وہ دفتر میں معمولی کلرک تھی ہر گھڑی ہیڈ کلرک سے واسطہ پڑتا۔ بار بار اُسے بلوایا جاتا۔ دوسرے بھی سر کا ہی

کام کے لئے بلایا جاتا ہے۔ لیکن میں سب جانتا تھا۔ ہاں تو کہہ رہا تھا، سب بابو لوگ چھوٹے بڑے، بیلے بے "بن بیلے" رانی کے گرد شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھناتے رہتے۔ ایسا کیوں نہ ہوتا، رانی ایک پھول ہی تھی۔ ایک رس بھری ہی تھی۔ میں دیکھتا رہتا۔ بینائی ذرا کم تھی۔ صاف دکھائی نہ دیتا۔ صاف صاف دیکھنے کے لئے میں نے عینک بھی چڑھائی۔ اور کر بھی کیا سکتا تھا؟ بھولا بابو کے سوا اور کوئی میرے ساتھ سیدھے مُنہ بات تک نہیں کرتا تھا۔ سب مجھے گھُور گھُور کر دیکھتے۔ جیسے میں چپراسی نہیں خُفیہ پولیس کا آدمی تھا۔ لیکن بھولا بابو کی بات دوسری ہی تھی۔ وہ نام اور شکل ہی کا بھولا نہ تھا دل کا بھی بھولا تھا۔ اپنے ساتھیوں سے الگ تھلگ رہنے والا بابو! خاموش، اور گمبھیر، چہرے پر گہری اُداسی کی جھلک لئے ہوئے سنجیدگی۔ آواز میں پیاری مٹھاس باتیں کرتے آنکھیں خود بخود جھک جاتیں۔ ہنستے وقت تو چہرے پر شوخی آجاتی ہے۔ لیکن بھولا بابو کی ہنسی میں بھی سنجیدگی تھی سنجیدگی، جس میں دُنیاداری کی ذمّہ داریوں کا احساس ہوتا ہے۔ اور خاندانی شرافت کی قدروں کا پاس بھی۔ عمر میں سب سے چھوٹا تھا۔ سب سے زیادہ معصوم خوب صورت اور محنتی تھا۔ جوانی کی ایک خاص عمر میں گہری سنجیدگی اور بے حد خاموشی انسان کو روگی بنا دیتی ہے۔ اپنے بزرگ ایسا ہی کہا کرتے تھے لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ سنجیدہ اور گمبھیر رہتے ہوئے بھی اُس کا چہرہ گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا۔ اپنا کام ختم کرکے دوسروں کا ہاتھ بٹاتا۔ رانی نئی تھی بھلے گھر کی لڑکی تھی۔ بے سہارا تھی۔ کلرک بن گئی۔ کلرکی میں کام کم ہوتا ہے۔ مغز کھپائی زیادہ۔ وہ مغز کھپائی کی عادی نہ تھی۔ جھنجھلا اُٹھتی۔ رو پڑتی۔ خاموش طبع تھی۔ کسی کو اپنا دُکھ درد بتاتی بھی

نہ تھی۔ بتاتی بھی کسے، وہاں چاہنے اپنانے والے تو تھے۔ لیکن ڈر، جھجک کے مارے خاموش بیٹھے صرف تاکتے۔ دل میں چور ہو تو محبت بھی چور ہی نظروں سے کی جاتی ہے۔ اپنے محلے کے مولوی اللہ رکھا کہا کرتے تھے۔ اور سچ ہی کہا کرتے تھے۔ لیکن بھولا بابو کی بات ہی کچھ اور تھی۔ ایک دو بار رانی کو پریشان دیکھا تو اسے اپنے پاس بلایا۔

"دیکھئے آپ جتنا کام آرام اور آسانی سے پانچ بجے تک کر سکتی ہیں کر لیا کریں باقی کام میں سنبھال لیا کروں گا۔ احسان نہیں کر رہا۔ یہ انسانی فرض ہے پریشان ہو کر رونا اپنی کمزوری کا مظاہرہ کرنا ہے۔ جو گناہ سے بدتر ہے"!

رانی نے اپنی جھکی ہوئی نظروں سے بھولا بابو کو ایسے دیکھا جیسے جس فرشتے کی اُسے تلاش تھی، وہ اپنے پاس ہی بیٹھا مل گیا ہو۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اپنی خوشی کا اندازہ میں اپنی اُداسی سے لگاتا ہوں۔ اُداس ہو جاؤں تو سمجھ لیتا ہوں کہ آج بہت خوش ہوں۔ کچھ پا لیا ہے۔ اور اُس کے بارے میں خاموش سوچنا چاہتا ہوں۔ بھولا بابو اور رانی کو ایک دوسرے کے قریب آمنے سامنے دیکھا۔ تو اُداس ہو گیا۔ اور پھر تو میں روز ہی اُداس رہنے لگا۔ اب دونوں کھل کر باتیں کرتے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا بھی دیتے۔ چند دنوں میں مجھے یہ بھی معلوم ہونے لگا کہ اُداس میں ہی نہیں، دوسرے بابو لوگ بھی اُداس رہنے لگے ہیں حالانکہ ان دونوں اُداسیوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ بھولا بابو بدل رہا تھا۔ اُس کی باتیں بدل رہی تھیں۔ اُس کی مسکراہٹیں بدل رہی تھیں۔ ایک عجیب نئی سی تبدیلیاں ہو رہی تھی۔ سنجیدگی کے گھرے بادل بھی چھٹنے لگے تھے۔ لیکن اُس کی تبدیلی

اتنی تعجب خیز نہ تھی جتنی کہ رانی کی۔ اب وہ ایک مسکراتی ہوئی کلی بن
گئی تھی۔ ہر ایک سے کھل کر ہنس کر باتیں کرتی۔ جیسے اس کی اکیلی تنہا
زندگی کو کوئی خوب صورت سہارا مل گیا ہو۔ بھولا بابو کی تبدیلی جہاں سب
کو کھائے جا رہی تھی، وہاں رانی کی تبدیلی سب کے لئے ایک شگفتہ بہار
بن رہی تھی۔ اپنے بہار کی آمد کے سوا گت کی تیاریاں ہر ایک کے چہرے اور
لباس سے مترشح تھیں۔ اُن ہی دنوں اُن تبدیلیوں کے چکر میں ایک خاص
بات ہوتی۔ وہ یہ کہ اب بھولا بابو کے کوٹ میں گلاب کا ایک پھول بھی دکھائی
دینے لگا تھا۔ ویسے تو عام سی بات تھی۔ لیکن وہ عام سی بات خاص یوں ہوگئی
کہ لنچ تک گلاب کا پھول بھولا بابو کے کوٹ میں رہتا۔ اور اس کے بعد رانی
کی اُنگلیوں میں چلا جاتا۔ میں نے بھی دیکھا حسبِ فطرت اُداس ہو گیا۔ دوسروں
کی نظروں میں بھی پڑیں۔ حسبِ عادت جل گئے۔ ایک دن میں نے کاظمی صاحب کے
تیور بھی بدلے ہوئے دیکھے۔ کہیں اُس نے بھی گلاب کا پھول بھولا بابو کے کوٹ
سے اُٹھکر رانی کے ہاتھوں میں پہنچتے دیکھ لیا تھا۔ فوراً حکم ہوا کہ بھولا بابو کی میز
اُس کے خاص کمرے میں لگا دی جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور میز خاص کمرے میں لگا
دی گئی۔ بھولا بابو کے لئے کوئی فرق نہ پڑا، اب وہ کاظمی صاحب کے کمرے میں بیٹھ کر
کام کرتا۔ صرف اتنا سا فرق پڑا کہ پہلے کاظمی صاحب دن میں کوئی درجن بار رانی کو اپنے
کمرے میں بلوا تا تھا۔ اب درجن بار خود رانی سے ملنے دوسرے کمرے میں جاتا۔ لیکن
یہ سلسلہ بھی زیادہ دیر نہ چلا۔ ایک دن اُس نے بھولا بابو سے کہا۔ میرے کمرے میں
بیٹھنے سے تم نے کافی بقایا کام ختم کر دیا۔ وہ بچارا صرف منہ دیکھتا رہ گیا۔

کاظمی صاحب نے پھر کہا۔

"دفتر میں لائٹ کام کس کے پاس ہے؟"

بھولا بابو نے فوراً جواب دیا۔

"لائٹ کام تو رانی ہی کو دے رکھا ہے۔ نئی نئی ہے۔ سیکھ رہی ہے۔ پھر وقت بے وقت اس کا ہاتھ بٹانے کی ضرورت ہے۔"

کاظمی صاحب نے ایک لمبی بدبودار سانس چھوڑی۔

"ٹھیک ہے، تم واپس اپنے کمرے میں چلے جاؤ۔"

بھولا بابو چونکا۔

"آپ کا مطلب ہے رانی کا ہاتھ بٹایا جائے!؟"

کاظمی صاحب نے تھوڑی دیر خاموشی کے بعد اپنے دل کی بات نکالی

"ہاں ایسا ہی خیال ہے۔ تمہارے پاس اپنا ہی کام بہت ہے۔ وہ میرے کمرے میں بیٹھا کرے گی۔ میں اُسے سمجھا دیا کروں گا۔"

بھولا بابو کی میز پھر اپنے پہلے کمرے میں آ گئی۔ گمبھیر سی مسکراہٹ سنبھالے وہ پرانے سے نئے کمرے میں گیا تھا۔ وہی مسکراہٹ لیے پھر نئے سے پرانے کمرے میں چلا آیا۔ اُس کے لیے تو کوئی فرق نہ پڑا۔ لیکن اس آنے جانے کے دوران میری اُداسیاں کافور ہو گئیں۔ شاید میرے المدد کے منتھو رام کی خوشی مر گئی تھی اور رانی بھی شاید خوش نہ تھی کاظمی صاحب کے کمرے میں اُسے گھٹن سی محسوس ہوتی۔ سروس کا معاملہ ہے گھٹن ملے چاہے تازگی کام کرنا ہی پڑتا ہے۔ آج یہاں بیٹھ کر، کل وہاں بیٹھ کر۔ مجھے خود کئی کمرے، کئی افسر اور کئی دفتر آج تک بدلنے

پڑے ہیں۔ دوسروں کے دل کا حال تو نہیں جانتا۔ لیکن مجھے رانی کی گھٹن کو دیکھ کر بہت کوفت ہوئی اور میں اسے برداشت نہ کرسکا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک کھوئی ہوئی لڑکی ہو۔ تنکے کا سہارا ملا تھا۔ وہ تنکا ہی ٹوٹ گیا۔ حالانکہ اب اُسے ایک مضبوط سہارا مل گیا تھا۔ کاظمی صاحب کا سہارا! وہ بڑے پیار سے اُسے کام سمجھاتا ایک بات نہ جانے کیوں میں محسوس کر رہا تھا کہ کام سمجھاتے سکھاتے کاظمی صاحب بُری طرح سے رانی پر جھک جاتا۔ جیسے اُسے نوچ کھانے کی سوچ رہا ہو۔ وہ رانی سے بھونڈے مذاق کرتا۔ اور رانی سب کچھ جانتے ہوئے بھی مسکراتی رہتی۔ بالکل گاؤں کی اُتھڑ جاہل لڑکیوں کی طرح۔ جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو۔ جیسے جانتی ہو اور اچھی طرح لیکن......!!

رانی کے کاظمی صاحب کے کمرے میں چلے جانے سے دوسرے بابو خاموش ہو گئے تھے۔ بھولا بابو سے چڑنے لگے تھے۔ کہ خشک زندگی میں اچانک شبنمی پھوار کا لمس حاصل ہوا تھا۔ اُس کی بدولت چھن گیا۔ بھولا بابو کے لئے تو کوئی خاص فرق نہ پڑا تھا۔ لیکن اُن سب کی زندگی بے کیف اور بے رونق ہو گئی تھی۔ اُمیدیں بندھ کر ٹوٹ گئی تھیں۔ دوسری دفتری کہانیوں کی طرح وہ بھی ایک کہانی تھی۔ جن کی ابتدا روز ہوتی۔ لیکن انتہا تک کبھی نہ پہنچتیں۔ میرے خیال میں رانی کی کہانی بھی ویسی ہی کہانیوں میں سے تھی۔ لیکن اُس کی ابتدا جتنی خاموشی سے آہستہ سے ہوئی۔ اُتنی جلدی اُس کا انجام بھی ہوگا میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ بات معمولی سی تھی۔ کاظمی صاحب ابھی اپنے خیالوں کے آدھے ہی راستے میں تھا کہ اُس کے چہیتے کلرک سعید بابو نے سب کی طرف سے شکایت کی کہ رانی اور بھولا ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اور محبت کی پینگیں بڑھائی بھی جاتی ہیں دفتری اوقات میں۔ دونوں کا پرائیویٹ معاملہ ضرور

ہے۔ لیکن دفتر میں دوسروں کے لیے بے چینی اور شکایت کا موجب ہے۔ کاظمی صاحب نے سُنا تو اُس کا ادھیڑ عمر دل اور دماغ ہی ہل گیا۔ چہرہ زرد ہو گیا۔ اُس نے اپنے طور پر جو بات بیچ ہی میں ختم کر دی تھی وہ ختم ہونے کی بجائے مکمل ہو رہی تھی۔ یا یہ تکمیل تک پہنچنے والی تھی۔ رانی اُس وقت میرے ساتھ دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ ساری باتیں سُن رہی تھی۔ میں نے سوچا، قصہ ختم ہو گیا۔ ہمیشہ کے لیے میری اُداسیوں کو ٹھکانہ مل گیا۔ لیکن تعجب ہوا۔ شام کو پانچ بجے کے بعد دونوں دفتر میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہنس رہے تھے۔ رانی ہنستے ہنستے ایک دم خاموش ہو گئی۔ اور دبی زبان میں پوچھا۔

"آپ نے کبھی اپنے بھولے پن کے بارے میں بھی سوچا ہے!"

بھولا بابو نے اپنی زندگی کا پہلا بھرپور قہقہہ لگایا۔

"میں تو حال کا آدمی ہوں۔ مستقبل دور ہے۔ ایک لمبی چھلانگ کی ضرورت ہے۔ اور میں ایک کمزور انسان ہوں۔ لیکن ....."

رانی نے بات کاٹ دی۔

"حال کے آدمی ضرور ہیں لیکن اپنے حال سے بے خبر ہیں۔"

بھولا رام نے اپنے بھولے پن کا ثبوت دیا۔

"میں اپنے حال سے باخبر ہوں۔ مجھے اپنے ایک ایک لمحے کا علم ہے!"

"کبھی اپنے آس پاس کے ماحول کو دیکھنے پرکھنے کا وقت بھی ملتا ہے یا نہیں؟"

"میرے آس پاس رکھا ہی کیا ہے۔ دفتر میں فائلیں، گھر میں گھر۔ ایک دفتر

اور ایک گھر اور ایک ۔۔۔۔۔"

"اور میں؟"

"تم ہاں ضرور ہو۔ ہمیں ایک دوسرے کا سہارا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کے سہارے کی ضرورت ہے۔"

رانی نے بھاری آواز میں کہا۔

"آپ کے پاس دل ہے لیکن دھڑکنیں نہیں ہیں ـــــــ دماغ ہے۔ لیکن ۔۔۔۔۔"

"میرے پاس دل کی دھڑکنیں بھی ہیں، دماغ کی سوچیں بھی ہیں۔ یہ غلط فہمی تمہیں کیسے ہوئی؟ اِس طرح کی باتیں کرنے کی آج ضرورت ہی کیوں محسوس ہوئی۔ میرا دل کسی کے لئے دھڑکتا بھی ہے اور کسی کے لئے سوچتا بھی ہے۔ اگر نہ سوچتا تو ہیں تمہیں ۔۔۔۔"

"اگر آپ کا دل کسی کے لئے دھڑکتا، دماغ کسی کے لئے سوچتا، تو مجھے یہ سب کچھ کہنے کی آج ضرورت ہی کیوں پڑتی۔"

"تمہیں کاظمی صاحب نے کچھ کہا ہے؟"

"سب ہی کچھ نہ کچھ کہہ رہے ہیں۔ میں بھی کہہ رہی ہوں۔ لیکن آپ بُت بنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ دوسرے سب کچھ جان گئے۔ آپ بھولے ہی بنے رہے!"

"اصل بات کیا ہے؟"

رانی جیسے رو رہی تھی۔

"مجھے آپ کا سہارا نہ ملتا تو میں نے کبھی کی نوکری چھوڑ دی ہوتی۔ میں چاہتی ہوں یہ سہارا قائم رہے۔ چاہتی ہوں ہم دونوں ـــــــ"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔

میں دروازے کے پاس دم بخود بیٹھا تھا۔

بھولا بابو نے رک رک کر بات شروع کی۔

"دیکھو رانی! تم نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ میں بے سمجھ ہوں۔ کیونکہ میرے لئے یہ سب کچھ نیا ہے۔ میرے ساتھ ایسی کبھی نہیں بیتی۔ تم نے میرے سہارے کو کچھ اور ہی سمجھا میری مدد کو کچھ اور ہی رنگ میں لیا۔ جو دوسرے تمہیں سمجھتے ہیں۔ میں نے ویسا تمہیں کبھی نہیں سمجھا۔ جیسے دوسرے تمہیں دیکھتے ہیں۔ میں نے ویسے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔ میں دوسرے ساتھی کلرکوں کی طرح تمہیں بھی ایک کلرک ساتھی ہی سمجھتا ہوں۔ ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانا، ہنسنا، مسکرانا، سہارا بننا ہم سب کا فرض ہے۔ احسان نہیں۔ جس کا بدلہ ایسی ویسی محبت سے چکایا جائے۔ اگر تم میرے دل کی محبت اور پیار کی بات پوچھتی ہو، تو مجھے محبت ہے۔ جنوں کی حد تک ہے۔ اور ـــــــ"

رانی چیخی۔

"میں بھی تو محبت ـــــــ"

بھولا بابو نے اپنی بات جاری رکھی "ہاں میں بھی محبت ہی کی بات کر رہا ہوں، مجھے محبت ہے۔ اور آخری حدوں تک ـــــــ"

رانی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"بھولا بابو ——!"

"ہاں —— لیکن وہ محبت صرف اپنی —— صرف اپنی بیوی سے ہے!"

"بیوی ——؟!"

"ہاں بیوی! جو تمہاری ہی جیسی ایک لڑکی ہے۔ خوبصورت اور معصوم۔ جو کبھی تمہاری ہی طرح بے سہارا تھی۔ اور رانی! کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ ایسا ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ہونا نہیں چاہیے کہ دو دل ——"

دروازہ کھٹاک سے کھُلا۔

میں دیوار سے لگ گیا۔

رانی بجلی کی طرح سیڑھیوں کی جانب لپکی۔ گلاب کا پھول ردی کی ٹوکری کے پاس پڑا تھا۔

میں نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُسے اُٹھالیا۔

دفتر بند کرتے ہوئے میں نے بھولا بابو سے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہے۔ لیکن ایک بات پوچھنی چاہتا ہوں۔ کیونکہ آج تک، اب تک میں سب کچھ دیکھتا آیا ہوں۔ سُنتا آیا ہوں۔"

بھولا بابو کے چہرے پر وہی پُرانی گمبھیر مسکراہٹ تھی۔ اُس نے مدھم سُر میں پُوچھا۔

"کیا ——؟"

"سب ٹھیک ہے۔ لیکن یہ بچارا گلاب کا پھول ——؟!"

اُس نے پھول میرے ہاتھوں سے لے کر اپنے کوٹ میں لگا لیا۔ اور سیڑھیاں اُترتے کہنے لگا۔

"اِس میں میرا کیا قصور ہے۔ ہمارے گھر میں جب سے گلاب کے پھول کھلنے لگے ہیں۔ میری بیوی ہر روز صبح میرے کوٹ میں ایک پھول لگا دیتی ہے۔ اگر رانی خود ہی پھول کوٹ سے اُتار لے اور اس کی کہانی بنا ڈالے تو اِس میں میرا کیا دوش ——؟"

میں خاموش ہو گیا۔

اور دوسرے دن بڑے صاحب کو سلام کر کے نئے دفتر میں تبادلہ کروا لیا۔ آج بہت مدت کے بعد شام بابو کے کوٹ میں گلاب کا پھول دیکھ کر مجھے نہ جانے کیوں بھولا بابو اور رانی یاد آ گئے۔ حالانکہ نئے دفتر میں شام بابو تو ضرور ہے۔ بالکل بھولا بابو کا گمبھیر روپ۔ لیکن رانی کوئی نہیں ——!!

زعفران کی لالی

زعفران کا مالی

اب کی بار علی جو پانپور میں زعفران کی بہت ساری وڈروں کا ٹھیکہ لے کر خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے زعفران وڈروں کا سارا رنگ اُسی کے ہاتھوں میں سمٹ آیا ہو!

علی جو آج سے چند سال پہلے پانپور کا ایک معمولی دوکان دار تھا۔ لیکن حالات نے اُس کا ساتھ دیا۔ اس نے زعفران اچھی خاصی تعداد میں خرید کر رکھا تھا۔ اور پھر جب زعفران کچھ نایاب سا ہوا، قیمتیں چڑھ گئیں تو اس کے ساتھ علی جو کی قسمت بھی عروج پر پہنچ گئی۔ جو زعفران اس نے زمینداروں سے چار روپے تولہ خریدا تھا وہی زعفران اُس نے بیس روپے تولے کے حساب سے فروخت کیا، علی جو ایک معمولی دکاندار سے ایک بڑا ٹھیکہ دار بن گیا —— ! زعفران کا ٹھیکہ دار !!

اب تو ہر سال وہ زعفران کا بیوپار کرتا، روپیہ روپیہ کو کھینچتا ہے۔ سینکڑوں، ہزاروں

میں بدل گئے اور علی جو زعفران کا بہت بڑا ٹھیکے دار بن گیا۔ اب کی بار تو علی جو نے زعفران کی تقریباً ساری وڈروں کا ٹھیکہ لے لیا تھا۔

مغلی اور سندری بھی گاؤں کی دوسری لڑکیوں کے ہمراہ وڈروں میں زعفران چننے جاتیں، اگرچہ انہیں اس کی چنداں ضرورت نہ تھی اور علی جو بھی اس بات کو پسند نہیں کرتا تھا کہ اس کی لڑکیاں گاؤں کی عام عورتوں کی طرح زعفران کی وڈروں میں بھٹکتی پھریں۔ کئی بار جب وہ صبح سویرے جھولیاں باندھ کر زعفران چننے کے لیے گھر سے نکلنے لگتیں تو علی جو اُن کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا۔

"مغلی، سندری، کہاں چل رہی ہو ——؟" علی جو پیار سے انہیں ڈانٹتا۔ "تمہیں اس مصیبت میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ خدا کا دیا سب کچھ ہے آرام سے بیٹھو، کچھ میری عزت کا خیال کرو —— لوگ کیا کہیں گے کہ علی جو اپنی لڑکیوں کو بھی زعفران چننے بھیج دیتا ہے ——"

مگر وہ جب ہنس دیتیں اور پیار سے پہلو بچا کر چلی جاتیں تو وہ خاموش ہو جاتا اور کچھ دیر بعد اپنی بیوی زیبہ سے ذرا سی تلخی کے ساتھ کہتا:

"بار بار کہتا ہوں، مجھے کچھ کہنے پر مجبور مت کیا کرو۔ خود ہی سمجھا لیا کرو، مگر تمہارے کانوں میں جوں تک نہیں رینگتی۔"

مغلی دس سال کی چھوٹی سی بچی تھی۔ بہت ہی معصوم اور شریف۔ اس کی ننھی سی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ جب گاؤں کی تمام لڑکیاں اور عورتیں زعفران چننے جاتی ہیں تو وہ کیوں نہ جایا کرے؟ نہ جانے بابا یہ کیوں روکتے ہیں —— وہ سوچتی۔ حالانکہ وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں میں کسی سے کم زعفران نہیں چنتی اور زعفران کے بہت سارے

گیت بھی اُسے یاد تھے۔ مگر سندری جانتی تھی کہ اس کا باپ انہیں کیوں زعفران چُننے سے منع کرتا ہے۔

سندری سولہ سال کی دوشیزہ تھی۔ وہ زعفران کے پھولوں ہی کی طرح سندر تھی۔ اس کا حُسن زعفران کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو شرما دیتا۔ وہ زعفران کا پھول تھی۔ ایک خوبصورت پھول۔ گاؤں کے مکانوں اور تنگ تاریک گلیوں میں اس کا جی نہ لگتا تھا اور جوں جوں وہ جوانی کی سرحدوں کے قریب پہنچ جا رہی تھی اس کا جی اچاٹ ہوتا جا رہا تھا۔ راتوں کو لیٹتے لیٹتے جب اس کی نظر اپنے مکان کی چھت پر پڑ جاتی تو اس کا جی متلا جاتا۔ وہ سوچتی کہ اس کے اور نیلے آسمان کے درمیان آخر اس تاریک چھت کی صورت میں یہ دبیز اندھیرا کیوں کھڑا کیا گیا ہے۔ نیل گگن پر جھلملاتے تاروں کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتی۔ ٹھنڈے پانی میں نہا کر وہ ایک عجیب سی لذت محسوس کرتی۔ جب برف گرتی تو برف کے گولے بنا بنا کر اپنے گالوں پر مَل لیتی، اس کے گالوں میں کچھ حدت سی پیدا ہو جاتی اور کبھی اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے اُس کے گالوں سے چنگاریاں نکل رہی ہوں اور وہ خود بھی تو برف کی طرح سفید اور نازک تھی۔ اُس کے چہرے کا رنگ ایسا لگتا تھا جیسے سفید برف میں زعفران کی لالی گھول کر رکھ دی ہو۔

آج دونوں بہنیں زعفران دیر تک چُنتی رہیں، مغلی کی جھولی تو زعفران کے پھولوں سے بھری پڑی تھی۔ مگر سندری کی جھولی میں دو چار ہی پھول تھے۔ آج نہ جانے وہ کچھ اُداس اور کھوئی کھوئی سی کیوں تھی۔ ایک انجانی سی آرزو

اس کے دل میں ہلچل مچا رہی تھی، شام کو جب سب عورتیں اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیں تو سندری ان میں نہیں تھی۔ وہ وہیں بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھیں دُور خلاؤں میں جیسے کسی کو ڈھونڈھ رہی ہوں۔ جیسے اُسے کسی کا انتظار ہو۔ علی کے گھر چلنے کے بار بار اصرار کرنے کے باوجود وہ وہیں بیٹھی رہی، شام ہوئی اور پھر رات پھیلنے لگی۔ زعفران کی وڈروں کے عقب سے چودھویں کا چاند ایک دہکتی ہوئی تھالی کے مانند ابھر آیا، چاندنی اپنے پورے شباب پر تھی۔

چاندنی اور پامپور کی زعفران زار وڈروں میں صدیوں سے ایک پیار اور دلکش سمبندھ چلا آتا ہے اور ان کے اس والہانہ پیار اور سمبندھ کے مقدس راز کو جاننے کے لئے ہر سال دور دراز ملکوں سے عیاش طبع لوگ زعفران کی اس وادی میں کھنچے چلے آتے ہیں۔ رومانی جوڑے ان کے پیار کو سمیٹنے چاندنی راتوں میں گھنٹوں ان وڈروں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ آج بھی چاندنی میں زعفران کے وڈروں میں اِدھر اُدھر شہر کے رنگین طبع جوڑے بانہوں میں بانہیں ڈالے گھوم رہے تھے۔ اور علی، سندری کو بھول کر ان کے دیکھنے میں محو ہوگئی تھی۔ اس کی ننھی سی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ لوگ رات گئے یہاں کیوں بھٹکنے کے لئے آجاتے ہیں۔

کچھ دیر بعد ایک کار زعفران کے وڈر میں آکر رک گئی۔ کار کے رُکتے ہی چند چھوٹی لڑکیاں نہ جانے کہاں سے آکر اس کے گرد جمع ہوگئیں۔ کار بابو نے کچھ سکے ان کی طرف بکھیر دیئے اور وہ لڑکیاں چل دیں۔ آج سُندری کا جی بھی کچھ مانگنے کو چاہ رہا تھا، مگر کیا؟ وہ اس سے بے خبر تھی۔ وہ بیٹھی رہی،

مغلی پھر کبھی بار اُسے لوٹنے کو کہہ چکی تھی، وہ حسب معمول خاموش بیٹھی رہی، ایک دو بار دھمکی دینے کی غرض سے مغلی وہاں سے چل بھی دی مگر دو چار قدم چل کر پھر واپس آگئی اور جھولی میں سے زعفران کے پھول اپنی ننھی سی مٹھی میں بھر بھر کر سندری کے مُنہ پر برسانے لگی۔ سندری ٹس سے مس نہ ہوئی، وہ اداس تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک انجانی سی خواہش انگڑائیاں لے رہی تھی!

کچھ دیر بعد سندری نے کروٹ لی اور کالے بابو کو اپنے قریب پایا، ایک خوبصورت نوجوان تھا، سر کے گھنگریالے بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایک لٹ ماتھے پر بہت ہی خوبصورت لگ رہی تھی۔ گلے میں کیمرہ لٹکا ہوا تھا۔

اُس نے اِردگرد نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ "ریسٹ ہاؤس کہاں ہے؟" سُندری چونک پڑی، اس نے ہاتھ کے اشارے سے دُور ریسٹ ہاؤس دکھا دیا!!

"شکریہ" ——— نوجوان یہ کہہ کر چل پڑا۔

ان کی ماں انہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں آنکلی اور وہ تینوں ماں بیٹیاں گھر کی طرف چل دیں۔

اب روز ہی سندری اور مغلی رات گئے تک زعفران کے وڈروں میں چاندنی سے لطف اندوز ہوتیں وہ نوجوان بابو بھی روز ہی زعفران کے وڈروں میں آجاتا، وہ سندری کے قریب بیٹھتا اور اُس سے باتیں کرتا!

"مجھے زعفران کے اس پھول سے پیار ہو گیا ہے۔" وہ ایک پھول کی طرف اشارہ کر دیتا مگر اس کی آنکھیں سندری کی طرف مرکوز ہوتیں ۔۔۔ سندری کے چہرے پر ایک سنہری سی مسکراہٹ دوڑ جاتی۔

سندری کی نیندیں اچاٹ ہو گئیں۔ اس کا انتظار ختم ہو گیا، وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔

جب چاندنی راتیں چلی گئیں تو ملاقاتوں نے شام کے دھندلکے سنبھال لئے۔

ایک دن بابو نہیں آیا۔ دوسرے دن بھی بابو نہ آیا، سندری انتظار کرتی رہی۔ تیسرے دن وہ مغلی کو وڈروں میں چھوڑ کر ریسٹ ہاؤس کی جانب نکل گئی۔ بابو باہر لان میں ٹہل رہا تھا۔ سندری کو دیکھ کر مسکرا دیا۔

سندری نے دور ہی سے پوچھا ۔۔۔ "تم آئے کیوں نہیں ۔۔۔"

بابو اس کے قریب آ گیا، "میں جانتا تھا تم مجھ سے ملنے آؤ گی۔ آؤ اندر کمرے میں بیٹھیں گے۔"

سندری نے نفی میں گردن ہلائی۔

"چلو وڈروں میں چلتے ہیں، وہاں مغلی اکیلی ہے۔"

بابو نے کچھ دیر سوچا۔ سندری کی آنکھوں میں جھانکا۔ پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"اندر آؤ میرے ساتھ، میں نے تمہارے لئے ایک چیز رکھی ہے۔"

"کیا؟" سندری نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

بابو نے اس کے ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا ۔۔۔

"میں تم سے پیار کرتا ہوں، ہم دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ میں تمہیں پیار کی نشانی دوں گا۔ تم اُسے سنبھال کر رکھنا اور پھر ایک دن . . . . ."

سندری نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ چل پڑی۔ شام کے دھندلکے اندھیرے ہو گئے تھے۔!

مغلی دیر تک انتظار کرتی رہی۔ مگر سندری واپس نہ آئی۔ جب اسے خوف محسوس ہوا۔ وہ گھر گئی۔ وہاں ان کی ماں بے صبری سے ان کا انتظار کر رہی تھی۔ بابا ابھی دوکان پر ہی تھا۔

"مغلی کہاں تھی اب تک —— سندری کہاں ہے؟" ماں نے آتے ہی سوالوں کی بوچھاڑ کی۔

"ماں۔ ماں ——" وہ کچھ کہہ نہ سکی!

"ہاں۔ ہاں۔ کہاں ہے سندری ——" ماں نے پھر پوچھا۔

"وہ تو رحیم ڈار کے لڑکے کے ساتھ جو کھنڈر ہے۔ اس کی طرف چل دی، میں انتظار کرتی رہی، مگر وہ واپس نہ آئی۔" نہ جانے کیسے مغلی سے جھوٹ بولا گیا۔

علی جو بھی دوکان سے آیا اور سندری کو نہ پاکر پریشان ہو گیا۔ نہ جانے کہاں گئی ہو — پھر باہر نکلا، رات کے بارہ بجے جب وہ لالٹین ٹٹولتا ٹٹولتا گھر میں داخل ہوا تو تیل ختم ہو جانے سے لالٹین کی بتی بجھ چکی تھی۔ لالٹین کونے میں رکھ دی اور اپنی بیوی کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ ساری رات بیٹھا رہا۔ مغلی کو کچھ کہنے کے

لئے مجبور کرتا رہا۔ مگر وہ خاموش بیٹھی رہی۔ ماں نے غصّے میں آ کر اُسے دو چار لاتیں بھی رسید کیں مگر نتیجہ نہ نکلا۔

صبح چھ بجے کے قریب دروازے پر نازک سی دستک ہوئی۔ مغلی نے دبے پاؤں جا کر دروازہ کھولا۔ سندری اندر آ گئی۔ ماں نے سندری کو سینے سے لگایا، خون ——؟ سندری کے کپڑے خون سے لت پت تھے، اس کا سارا جسم ہی جیسے خون سے شرابور تھا۔

علی جو نے آنکھیں اُوپر اُٹھائیں۔ سندری کو دیکھا۔

"کہاں رہی رات بھر —— یہ خون کیسا ہے؟"

سندری چپ تھی

"بولتی کیوں نہیں"

سندری چپ تھی۔

"ارے بولے گی کہ نہیں ——" علی جو کھڑا ہو گیا۔

سندری چپ تھی!

مغلی چپ تھی!!

زیبہ چپ تھی!!!

علی جو آگے بڑھا۔ سندری کے مُنھ پر طمانچوں کی بارش کر دی۔ ماں کا دل پیار سے بھر آیا۔ "کیا کرتے ہو۔ کوئی سُن لے گا۔ لڑکی جوان ہے، بدنامی ہو گی ——"

اس نے سندری کو سینے سے لگایا، اور پیار سے کہا۔ "کہو بیٹی کیا بات

ہے۔ رات بھر کہاں رہی ـــــ یہ خون کیسا ہے ؟"

ایک دم سندری کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمنڈ آیا۔ مگر وہ خاموش رہی، باپ نے مارنا شروع کر دی۔ مغلی کا دِل بھر آیا۔

"بابا۔ سندری کو مت مارو۔ میں کہدوں گی کہ سندری رات بھر کہاں تھی ـــــ"

...... اور مغلی نے سارا قصہ کہد یا!

علی جُو کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اُس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کلہاڑا سنبھالا۔ اور ریسٹ ہاؤس کی طرف چل دیا۔ زیبہ نے روکنا چاہا۔ اپنی عزت کا واسطہ دیا مگر اُس پر جنوں سوار ہو گیا تھا۔ وہ ریسٹ ہاؤس پہنچ گیا، وہاں لوگوں کا ہجوم تھا۔

علی جُو کے کانوں سے اچانک آواز ٹکرائی۔ ریسٹ ہاؤس کا بوڑھا چوکیدار لوگوں سے کہہ رہا تھا ـــــ وہ اپنی عصمت کو بچانے کے لئے بچاری نے شہری بابو کا خون کر دیا۔ حالانکہ دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے۔ روز شام کو ملتے تھے ـــــ"

علی جُو نے کمرے کے اندر جھانکا، مرجھائے ہوئے زعفران کے پھول تھے اور ایک نوجوان کی لاش تھی۔ وہ واپس پلٹا۔ اس کے ہاتھوں میں تھما ہوا پہاڑی کلہاڑا تھر تھرا رہا تھا۔ سامنے ہی وڈر میں زعفران کے اَن گِنت پھول مسکرا رہے تھے۔ علی جُو کے سامنے خون میں رنگی ہوئی سندری کی لاش پھر گئی۔ اور اس کے برف جیسے سفید بدن پر سرخ سرخ خون کے چھینٹے زعفران کے پھولوں کے مانند بکھرے ہوئے تھے۔ اس

کے چاندی سے ہاتھ اپنے محبوب کے خون میں رنگے ہوئے تھے۔ جیسے زعفران کی
مہندی لگی ہو۔ علی جو کو ایسا لگا جیسے زعفران کے ان سارے پھولوں کی لالی
سناری کے ہاتھوں میں ہی سمٹ کر آگئی ہو۔

"سناری ــــــ میری بیٹی ـ" علی جو کا اندر کا انسان جاگ اٹھا کلہاڑا
اس کے ہاتھوں سے جیسے چھوٹ گیا تھا۔ اور وہ تیز تیز قدموں سے اپنے گھر کی
طرف بھاگا!

گھر پہنچ کر علی جو نے دیکھا کہ اس کے اپنے زعفران کی لالی بھی زرد پڑ کر
مرجھا چکی تھی۔ اس نے کلہاڑا ہوا میں لہرایا۔ اور ایک چیخ مار کر زمین پر اوندھے
منھ گر پڑا۔!

پتھر کا دل

پتھر کا دل

یہی موسم!

اپنی وسعتوں میں سپنوں بھری فضاؤں کی غنودگی سمیٹے ہوئے! یہی

وقت!!

اپنی دھڑکنوں میں یادوں بھری کہانیوں کی کہکشاں سنوارے ہوئے

یہی راستہ!!!

اپنی تاریکیوں میں تاروں بھری راتوں کی جگمگاہٹ جگائے ہوئے۔

میری نگاہوں کے سامنے میرے دیکھتے دیکھتے موسم، وقت اور راستے میں ایک عجیب سا تصادم ہوا، فضاؤں کی غنودگی، کہانیوں کی کہکشاں اور راتوں کی جگمگاہٹ ایک دوسرے میں غیر اختیاری طور پر تحلیل ہو گئیں اور ایک نئی خوش بخت کہانی کی صبح جاگی!!!

میں نے اُس نئی صبح کے سورج کو کسی کے اندھیروں میں اُگتے دیکھا ہے، اُس کی پہلی شرمیلی چنچل کرن کی سرگوشی بھی سُنی ہے۔ میں نے اُس چنچل صبح کو میٹھی میٹھی حدت کی دوپہر بنتے بھی دیکھا۔ دوپہر کی شام ڈھلتی بھی دیکھی اور وہ رات جب اُتری تھی ——— کالی سیاہ اندھیری رات ———؟!

ایک دُنیا کی دوڑ ختم ہو گئی، کہانی کے واضح خد و خال ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئے۔ پرچھائیاں اُبھریں۔ دیکھتے دیکھتے سب کچھ دُھند میں غائب ہو گیا۔ خیالوں کی مٹ مِٹیالی دیوار پر دھندلے دھندلے سائے۔ تھرتھرائے ——

نور!

صغرا!!

ایک تاریک اندھیرے کے دو روشن کونے!!!

نور میرا اپنا تھا جیسے بچپن کے ساتھی اپنے ہوتے ہیں۔ جیسے محلے کے ہم عمر ساتھی اپنے ہوتے ہیں جیسے زندگی کے سفر کے راہی اپنے ہوتے ہیں اور نہ دراصل صورتی صغرا بھی کون بیگانی تھی۔ لیکن تب تو بیگانی ہی تھی جب نور سے ملی، ملاقات کی بات ہے اور پہلی ملاقات کبھی اپنی ہوتی ہے کبھی بیگانی۔ ایک دھڑکتے لمحے کی بات ہے وہ لمحہ کبھی مر جاتا ہے کبھی ہمیشہ کے لئے امر ہو جاتا ہے۔ کچھ ماضی کی جانی پہچانی یادوں کی بات ہے، کچھ مستقبل کی انجانی کہانیوں کی بات ہے۔ نور اور صغرا کی اجنبی سی ملاقات میں بھی کچھ ایسی ہی بات بن گئی!۔

اور ان دونوں کی پہلی ملاقات کی وہ معصوم سی مسرتیں میرے سامنے ہیں، اب بھی نگاہوں کے سامنے کم سن یادوں کی طرح جھمک رہی ہیں جو میں نے ایک برستی شام کے بھیگے بھیگے دھندلکوں میں نوذر کے متین مسکین چہرے پر ابھرتی ڈوبتی دیکھیں۔ میں حسب معمول برآمدے میں بیٹھی مطالعہ میں مشغول تھی۔ نوذر پاس سے گزرا، بغیر رکے آگے نکل گیا، گلی میں آتے جاتے ذرا بھر رک کر ایک ہی فقرہ دہراتا تھا۔

"کیسی ہو؟"

اس کی عادت پر مسکرا کر ہر بار ایک ہی جواب دیتی۔

"اچھی ہوں"

لیکن اس دن حسب معمول اس کے قدم نہ رکے۔ میں نے پکارا۔

"آج کیا بات ہے"

وہ سر جھکائے میرے قریب آیا۔

"عجیب سی بات ہو گئی، سُنانا بھی چاہتا ہوں اور نہیں بھی۔"

میرے دیسی نوذر کے منہ سے یہ نیا فقرہ تھا، لہجہ بھی نیا تھا چھوٹے سے گھرانے کا چھوٹا سا فرد تھا، اچھا پہنتا تھا، اچھی صورت تھی دور سے دھوکہ کھا جاتے کسی رئیس خاندان کا شہزادہ ہی سمجھتے لیکن اس کے چہرے پر جو اداسیاں تھیں، آنکھوں میں احساس کمتری کی جو پرچھائیاں تھیں میں ان سے بخوبی واقف تھی، اس کی بدلی ہوئی صورت کا بدلا ہوا لہجہ پہچانا تو تذبذب میں پڑ گئی، بات کی تہہ تک پہنچنے کی جسارت کی۔

"ایسی کونسی بات ہو گئی جو سنانا بھی چاہتے ہو اور نہیں بھی۔"

وہ میرے قریب آ گیا اور سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

"آج کالیج کی ادبی نشست میں میری نظم بہت پسند کی گئی۔ وہی نظم۔ پھر کوئی یاد آ رہا ہے"

میں نے کریدا۔

"تمہاری نظمیں تو عموماً پسند کی جاتیں ہیں، نئی بات کیا ہوئی؟۔"

اُس نے میٹھا گھونٹ بھرا۔

"نئی بات یہ ہوئی کہ صغرا نے بس سٹاپ پر پورے چالیس منٹ میرا انتظار کیا، صرف یہ کہنے کے لیے کہ وہ میری نظم سے بہت متاثر ہوئی۔"

میں خاموش رہی۔ صغرا ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی تھی۔ خوب صورت گھرانے کی ایک خوبصورت خوش بخت لڑکی تھی۔ بھڑکیلا لباس پہنتی جو نگاہوں کو بے ساختہ اپنی طرف کھینچتا۔ بڑے گھرانوں کے لڑکوں لڑکیوں سے ہی ملتی۔ ہم لوگ ٹھہرے چھوٹے، چھوٹے یا درمیانہ گھروں کے، ایک ہی کالیج میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے بھی کم ہی بول چال تھی، میں نے سمجھ لیا کہ نور کے لباس اور خدوخال سے صغرا کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی جذباتی سی لڑکی تھی ہو سکتا ہے کہ نور کی شاعری نے بھی ہاتھ بٹایا ہو۔

نور نے اپنی بات پوری کی۔

"کہنے لگی کتابیں پڑھنے کا شوق ہے، خصوصاً شاعری سے مجھے لگاؤ ہے، اچھے اچھے شاعروں کے مجموعے ہوں تو دے دیجئے۔ لوٹا دونگی۔"

"تم نے کیا جواب دیا"

"میرے پاس بس شاعری ہی شاعری ہے، تمہارے پاس نئے پرانے شعراء کی بے شمار کتابیں ہیں،

کل دے دینا اور۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

میں نے بات کاٹ دی۔

"اور کہہ دینا نور صاحب نے بجھوائی ہیں۔"

"ہاں۔ ہاں یہی میرے منہ کی بات چھین لی۔"

"لیکن اگر پوچھ بیٹھی تم اُس کی کیا ہو؟"

"بس وہی، جو کچھ ہو۔ ایک محلے دار۔"

میں ہنس پڑی۔

وہ چلا گیا۔ اور میں نے ایک محلے دار کے ناطے نور کا دل رکھنے کے لیے صغرا کو کتابیں دیں۔ یعنے لوٹانے کا سلسلہ کافی دن رہا نہ چاہتے ہوئے بھی ہم ایک دوسرے کے قریب آ گئیں۔ بغور اس کے خیالوں کا جائزہ لیا۔ صغرا ان لڑکیوں میں سے تھی جو اپنے امیرانہ جاہ و جلال سے متاثر ہوتی ہیں۔ جن کے پاس اتنا وقت اور سکون ہوتا ہے کہ تخیلی دُنیا کی وسیع و عریض وسعتوں میں گھوم پھر سکیں، اپنی تخیلی بلندیوں سے پستیوں کی ہر ایک چیز حقیر دکھائی دیتی ہے۔ جذباتی فطرت کو اپنائے ہوئے بھی ایسی لڑکیوں کو نہ محبت ہو جاتی ہے اور نہ ہی وہ محبت کرتی ہیں، اُن کی ہر بات ہر خواہش مذاق سے شروع ہوتی ہے اور مذاق پر ٹوٹ جاتی ہے۔ صغرا بھی فطرتاً ایسی ہی لڑکی تھی۔ نئی نئی ملاقاتیں تھیں اُن میں شاعری زیادہ تھی، اُس دور کی باتیں نور سنا

جاتا۔ جب ملاقاتوں میں شاعری کم ہونے لگی حقیقی لگاؤ کا عنصر بڑھنے لگا۔ ہونٹ خاموش ہو گئے۔ صغرا نور کے نام پر صرف مسکرا دیتی۔ نور نے اپنی مسکراہٹیں بھی نظر بد سے چھپا لیں۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ شاعر نے اپنے تخئیل کی حسین ترین بلندیاں چھو لیں تھیں۔ اپنے احساسات کا ارتقا پا لیا تھا میری نظروں کے سامنے جس زندگی نے جنم لیا تھا وہ میری نظروں سے اوجھل بن سنور رہی تھی۔ میں ایک محلے دار کے ناطے خوش تھی۔ لیکن میری اُن خوشیوں کی دوڑ خیالی اندازوں تک ہی رہی۔

غم جاناں نہیں رہتا تو غم دوراں شدت اختیار کر لیتا ہے۔ کیونکہ ساتھی بن جانے پر سفر کی ذمہ داریاں زندہ ہو جاتی ہیں۔ ایک منزل پا لینے کی جستجو مچلنے لگی ہے۔ نور نے شاید اپنے خیالوں کی محبت اور اُس کی روح پالی تھی اب اس کی شاعری میں حال کے درد کے ساتھ ساتھ مستقبل کی دلبری بھی تھی۔ ایک بار اُس نے کالج کی ایک ادبی نشست میں ایک نظم پڑھی۔ جس کے پہلے بند میں اپنی محبوبہ سے دل کا راز افشا کرنے کی تمنا کا اظہار تھا۔ نئے انداز سے پرانی بات دہرائی گئی تھی وہ سروں کے ساتھ صغرا نے بھی داد بھری چٹکی لی۔

"تو پھر کہیئے۔ سننے والے منتظر بیٹھے ہیں!"

شاعر نے اپنی تمنا کا اظہار کیا۔ نظم کا دوسرا بند پڑھا، جس کا مفہوم تھا ——

اگر کوئی مجھ سے میرے دل کی دھڑکنوں اور گیتوں کے بارے میں پوچھے تو میں اُسے تیرے سامنے کھڑا کر دوں گا کہ تو ہی میری دھڑکنیں میرے گیتوں کا سرچشمہ ہو۔

میں جانتی تھی، صغرا جانتی تھی اشارہ کس طرف تھا۔ میں نے چھیڑا وہ

صرف مسکرا دی، وقتی لگاؤ نے محبت کا پاس پہن لیا تھا۔

اُن دونوں کی ملاقاتیں سلامت رہیں، نور کی خوشیاں سلامت رہیں! انہی ملاقاتوں اور خوشیوں کی محبت بھری کہانیوں میں تعلیم کی ایک عمر ختم ہو گئی۔ بی۔اے کی ڈگریاں مل گئیں، ایک مرحلہ طے ہو گیا، صغرا نے تعلیم کا ایک مرحلہ اور طے کرنا تھا نور بھی اس کا ساتھ دینا چاہتا تھا لیکن گھر کے حالات سد راہ تھے۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش شرمندہ تعبیر نہ ہوئی!

کالج چھوٹنے کے ساتھ ساتھ محبت بھری ملاقاتیں چھوٹنے لگیں، اب ملاقات کے لمحے کبھی کبھار ہی ملتے۔ ایک طرف فراغت تھی دوسری طرف زندگی کی مصروف اُلجھنیں، درمیان میں محبت کھڑی تھی، مختصر ہوتے ہوئے بھی بوجھل تھا، شاعری کہاں تک ساتھ دیتی، ایک دن شاعر نے اپنی تمناؤں کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ کر اپنی چھوٹی سی بھوکی ننگی زندگی کو سنبھالا دینے کی جسارت کر ڈالی۔ فضا غیر رومانی تھی۔ پیشہ غیر رومانی تھا۔ شاعری نہیں چل سکتی تھی، لیکن اپنی چھوٹی سی دُنیا کی حقیقتیں ضرور پوری ہو سکتی تھیں۔ ایک زمانہ مر گیا ایک خیال کمزور پڑ گیا، ایک زمانہ زندہ ہو گیا۔ ایک خیال مضبوط ہو گیا، محبت قائم رہی ملاقاتیں کم ہو گئیں۔ خیال قائم رہے شاعری کم ہو گئی، تخئیلی دُنیا کا لبادہ اُتار کر جب اُس نے حقیقی دُنیا کی پوشاک پہنی تو دیکھا وہ ایک معمولی حقیر سا کلرک ہے، جسے اپنی ذات بھی نفرت کرتی ہے کہ وہ اسے بھی مطمئن نہیں کر سکتا۔

شاعری اور محبت کا چولی دامن کا ساتھ ہے، کبھی کبھار مل بیٹھنے کی تڑپ جاگ ہی پڑتی! کلرکی اور محبت میں فطری بُعد ہے، نہ ملنے کے بہانے بن ہی جاتے ہیں!!۔

کئی دنوں کے بعد محبت اور کلرکی کو ایک دوسرے سے ملنے کی فرصت مل گئی ہے، گا وہی سرسبز باغ تھا، باغ کا خوبصورت سرسبز فرش تھا، جس نے اُن دونوں کی محبت کو پروان چڑھتے دیکھا تھا، وہی پودے وہی پھول وہی پتے۔ جو کئی بار مرجھا کر محبت کی کہانی سُننے کے لئے ہرے ہوتے تھے۔ کلرک خوش تھا کہ اُس کی دیرینہ چاہت اُس کے ساتھ لگی بیٹھی تھی، محبت مغموم تھی کہ ایک کلرک ایک عام سی زندگی کا سہارا فلسفہ لوہے کی ترازو پر تول رہا تھا۔

صغرا نے ناراضگی کا اظہار کیا۔

"شاعری ہی کرتے، کلرک کیوں بنے؟"۔

"شاعری دو چار زندہ انسانوں کو سانسیں مہیا کر سکتی تو کلرکی کو کیوں اپناتا۔؟ ویسے بھی تو میں کلرک اپنے بوڑھے ماں باپ اور جوان بہن کے لئے ہوں، دوسروں کے لئے ہوں، تمہارے لئے تو وہی شاعر ہوں، جس کی نظمیں تم نے اپنی سریلی آواز میں دوسروں کی تسکین کے لئے گائی ہیں"۔

"کلرک کی بھی کوئی محبت ہوتی ہے، کوئی زندگی ہوتی ہے، عزت اور نہ دولت ——"

نور نے اُس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"آج عجیب سی باتیں کر رہی ہو۔ کشمکش کا نام ہی زندگی ہے، کشمکش کا نام ہی شاعری ہے، کشمکش کا نام ہی کلرکی ہے، ابتدا تمہاری نظروں میں بد صورت سہی لیکن انتہا تو خوبصورت ہے کون جانتا ہے کل میں تمہارے خوابوں کا نور بن جاؤں، تمہارے حسین ترین سہارے پر میں کہاں ہے کہاں

پہنچ سکتا ہوں"

"یہ سب شاعری ہے"

"نہیں یہ سب حقیقت ہے"

"لیکن یہ غیر رومانی حقیقت - - - - -"

نور نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

"آؤ آج اس غیر رومانی حقیقت کو رومان کی ابدی سانسوں سے شگفتہ کر ڈالیں۔ دیکھو اس اُبھرتی رات کی پریشان زلفیں اور دیکھو وہ اپنے بچپن کے ساتھی برفانی چوٹیوں پر پورے چاند کی رقصاں چاندنی اور دور پرے ذرا اپنی نظریں گھما کر دیکھ۔ نیلگوں وسعتوں میں لاتعداد ستاروں کی تھرک۔ دیکھ آج کے ان چند لمحوں میں ٹمٹماتے ستارے بھی ہماری محبت کی داستان میں شریک ہیں۔ جانتی ہو کیوں؟ کیونکہ محبت کا تعلق روح سے ہے، انسان سے ہے، امیری اور فقیری سے نہیں۔ دولت اور امارت سے نہیں نام اور - - - !"

صغرا نے ٹوک دیا۔

"مجھے یہ شاعرانہ باتیں بالکل پسند نہیں"۔

نور نے اپنی زندگی میں پہلا دھچکا کھایا۔ اُسے لگا جیسے صغرا کو جان پہچان اور محبت لگاؤ کی ابتدا ہی پسند نہیں!

اُس نے اُداس لہجے میں کہا۔

"صغرا محبت تو انسان سے کی جاتی ہے، پیشے کی بلندیاں اور پستیاں اُس کا راستہ نہیں کاٹتی"۔

صغرا نے خشک گھونٹ بھرے
نور نے بات چیت کا موضوع بدلا۔
"اب تم بہت کم ملتی ہو؟"
صغرا نے اپنی سوچوں میں ڈوبے ہوئے جواب دیا۔
"وقت ہی کہاں ملتا ہے"
"شام کو تو چند لمحے اکٹھے گزار سکتے ہیں۔"
صغرا نے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔
"تم نے اپنی کشمکش کا انجام پا لیا۔ میری کشمکش ابھی جاری ہے، تعلیم کے لئے بھی اور اپنے خوابوں کے لئے بھی۔"
نور کی اپنی جدوجہد کی بھی جیسے تکمیل نہ ہوئی ہو۔ اُس نے صغرا کے لہجے پر بات کی۔
"تم ٹھیک کہتی ہو، ہماری کشمکش ابھی تک جاری ہے، تمہاری کامیابیوں میں ہی میری ناکامیوں کی جیت ہے۔ میں انتظار کروں گا، تمہاری کشمکش کی تکمیل کا، خوابوں کی تعبیر تک ......"
صغرا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی، ویسی ہی جیسے ملاقاتوں کے دور میں نور کے نام پر مسکراہٹ دوڑ جاتی تھی۔
تھوڑی دیر تک دونوں اپنے اپنے خیالوں میں ڈوبے رہے۔
نور نے پھر کہا۔
"اب ملاقات کے لئے تمہارے اشارے کا منتظر رہوں گا۔ جب فرصت

ہو اور میرا خیال آئے۔ تو مجھے اشارہ کر دینا میں اپنے سود مضار سے چھوڑ کر آجاؤں گا۔"

صغرا کے ہونٹ خاموش رہے، اُس کی گردن نے ہلکی سی جنبش کی، اُس ہلکی سی جنبش میں نور کے لئے اُمیدافزا لمحوں کی ان گنت لرزشیں تھیں۔ اور لمحے گزرتے گئے۔

وہی موسم —— وہی وقت —— وہی راستہ . . . . صرف انتظار کے فاصلے طویل ہو گئے!

شاعر انتظار کی کبھی نہ بجھنے والی آگ میں تپ کر کندن بن گیا۔ اُس کی شاعری نکھر آئی۔ اُس نکھار میں حقیقی دُنیا کی تصویر تھی حقیقی محبت کی جھلک تھی، نور کی صحت گرتی جا رہی تھی، لیکن آنکھوں میں بھرپور صحت مند زندگی کی رمق تھی، آواز میں سوز اور درد کے ساتھ بھرپور توانائی تھی، ہونٹوں نے ابدی مسکراہٹ پالی تھی۔

ایک شام اُس نے میرے ساتھ گزاری، میں اُسے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن وہ میرے قریب آتا، مجھے گھور کر دیکھتا، یونہی مسکرا دیتا اور مسکراتے ہوئے چلا جاتا۔ لیکن اب کی بار میرے پاس بیٹھ کر باتیں کرتا رہا، اِدھر اُدھر کی باتیں۔ اُس کی باتوں میں زندگی اور محبت کا کوئی فلسفہ نہ تھا، صغرا کا بھی ذکر نہ تھا۔ البتہ بہن کی شادی کا ذکر تھا، بوڑھے ماں باپ کی مہربان شفقت کا ذکر تھا، لہجے میں اُمید تھی، حوصلہ تھا، میں نے گفتگو کا موضوع بدلا۔

"سب کا خیال تب ہی رکھ سکو گے جب اپنی صحت کا خیال کرو گے؟"

اُس آنکھیں چمکیں۔

"صحت میری کمزور ضرور ہے۔ لیکن میری آواز میں طاقت اور زور پیدا ہو گیا ہے، بہرے کانوں تک میری آواز پہنچ گئی ہے۔ سب مجھے پہچاننے لگے ہیں۔ تمہیں شاید معلوم نہیں۔ مجھے ایک نیا اور بڑا عہدہ ملنے والا ہے۔"

خوشی سے زیادہ مجھے تعجب ہوا۔ میں نے اُونچی آواز میں پوچھا۔

"سرکاری عہدہ ؟"

"ہاں سرکاری جریدے کی اڈیٹری مل رہی ہے۔ تمہاری طرح مجھے بھی خوشی سے زیادہ تعجب ہو رہا ہے۔ گھبرا سا گیا ہوں۔ نہ جانے کیوں اور کئی دنوں سے یہی گھبراہٹ میری صحت پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ دوسروں کی طرح تم بھی چاہے کچھ سمجھ لو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کلرکی مجھے پسند آئی۔ میں نے زندگی کا قُرب پالیا ہے۔ اُس کی بدولت بہت کم کھو دیا، میں نے بہت زیادہ حاصل کر لیا۔"

مُنہ سے میرے من کی بات نکل گئی۔

"اور وہ صغرا ——— میں تمہیں بتا دینا چاہتی تھی کہ وہ ..

..... "

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا ——— اُس کی یہ کھلکھلاتی ہنسی میرے لئے اجنبی سی تھی، میرا مُنہ کھلا کا کھلا رہا ——— گلا خشک ہو گیا۔

"جو کچھ تم بتانا چاہتی ہو، میں جانتا ہوں۔ تم بتانا چاہتی تھی، میں سُننا نہیں چاہتا تھا، اِسی لئے چاہتے ہوئے بھی میں تم سے نہ ملا۔ میں جانتا ہوں،

صغرا کی کشمکش کی تکمیل ہونے والی ہے۔ اُسے اپنے خوابوں کی تعبیر ملنے والی ہے۔ وہ کمال کو اپنا رہی ہے۔ کمال میرا اپنا ہے جیسے صغرا میری اپنی تھی۔ دونوں میرے دوست ہیں، میں نے اُنہیں باغ میں ٹہلتے دیکھا ہے، تم نے بھی دیکھا ہوگا۔ تم نے ایک دو بار دیکھا ہوگا۔ میں نے اپنے انتظار کے ہر لمحے میں دیکھا ہے۔ مجھے خوشی ہوئی۔ ورنہ خواب خواب ہی رہتے۔ خیال خیال ہی رہتے اور میرے اندر کا شاعر دم توڑ دیتا۔ مجھے خوشی ہے کہ حقیقت یہی ہے، صغرا کا باپ ہزاروں کا مالک اور کمال کا باپ لکھ پتی۔ ہزاروں لاکھوں کی جانب ہی سرکتے ہیں۔ انسانی فطرت کا یہی دستور ہے یہی تقاضا ہے محبت نے سوجھ بوجھ پالی۔ اب بلندیوں کو ہی جھانکتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مسکراہٹ لئے آیا تھا مسکراہٹ لئے لوٹ گیا۔ نہ جانے کس احساس کس جذبے کے زیر اثر میری آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے!

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر بہت سے دن ایک ساتھ گزر گئے۔ اسی دوران نور کو نئی ملازمت مل گئی۔ اُسی دوران اُس نے اپنی بہن کا ٹھاٹھ سے بیاہ کیا، اپنے بوڑھے ماں باپ کی ناامید آنکھوں میں مسرتوں کی بصارت جگائی چند دنوں ہی میں اُس کی چھوٹی سی دُنیا کا سب کچھ بدل گیا۔ نہ بدلا تو نور ــــ نہ بدلے تو نور کے خیالات، وہی لباس، وہی چال ڈھال، وہی مسکراہٹ صدیوں پرانی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اب میرے پاس رک کر وہی اپنا پرانا فقرہ دہراتا ــ وہی پرانے دو لفظ۔
"کیسی ہو؟"

اُس کی عادت پر مسکرا کر ایک ہی جواب دیتی، وہی پرانے دو لفظ ــــ

"اچھی ہوں!"

نور کی کشمکش کی تکمیل میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتی دیکھی، اُس کے خوابوں کی تعبیر میرے سامنے ہوئی ــ میرے دیکھتے دیکھتے وہ اپنے خیالوں کی بلندیوں کی جانب بڑھا میرے دیکھتے دیکھتے انہیں اپنے ہاتھوں سے چھوا ــــ ایک تن تنہا بے سہارا زندگی کا اتنا حوصلہ ــــ میری آنکھیں سجدہ کرنے لگیں صغرا کی کشمکش کہاں پہنچی، اس کے سنہرے خوابوں کی کیا تعبیر ہوئی، میں نہیں جانتی، اِس لمحے تک مجھے کوئی علم نہیں، شاید یہ نور بھی نہیں جانتا۔ ہو سکتا ہے صغرا خود بھی نہ جانتی ہو، اُسے عام لوگوں سے نفرت تھی، عام سے پیشوں سے نفرت تھی، وہ عزت، دولت اور نام کی بھوکی تھی، ہو سکتا ہے۔ اُس نے زندگی اور انسانی حقیقت پالی ہو لیکن یہ حقیقت ہے، کہ ہمارا جب بھی آمنا سامنا ہوا، ہم نے ایک دوسرے سے آنکھیں چرالیں۔ وہ اکثر اکیلی ہی ہوتی میں نے اُس کی نگاہوں میں ہمیشہ ایک تلاش دیکھی، ایسی تلاش جو خوبصورت بھڑکیلی جوانی میں جب بھی جاگتی ہے، پریشان بھٹکتی پھرتی ہے۔ اُس کی کبھی تکمیل نہیں ہوتی۔ اُسے کبھی منزل نہیں ملتی!

. . . . . . کل شام کی ہی بات ہے۔ میں اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی، نور آ گیا، بہت خوش تھا، کیوں کہ اُس کی بہن سسرال میں خوش تھی، اُسے اچھا ساتھی مل گیا تھا بہن کی خوشیاں بھائی کے چہرے پر ناچ رہی تھیں، ابھی ابھی اس سے مل کر آرہا تھا۔

"اماں کہاں ہیں ——؟"

اُس نے بڑے عجیب لہجے میں پوچھا، میں کچھ جھینپ سی گئی۔

"تمہارے گھر گئی ہے، کیا کام ہے؟"

"کوئی خاص کام نہیں۔ خیال آیا اماں سے مل لیتا ہوں۔"

وہ میرے پاس ہی بیٹھ گیا، اپنی ہی کوئی نظم گنگنا رہا تھا۔

میں نے بات چلائی۔

"ساری عمر شاعری ہی کرو گے؟"

"تمہارا مطلب ہے شادی بھی کر لینی چاہیے۔"

میں نے بے تکلفی کا سہارا لیا۔

"اور کیا سب کی زندگیاں سنوار ڈالیں، لگے ہاتھوں اپنی دُنیا بھی بسا ڈالو!"

اُس نے کھُل کر ہنسنے کی کوشش کی۔

"خیال تمہارا خوبصورت ہے، اپنے پرائے بھی تنگ کر رہے ہیں، اماں بھی آنے جانے والوں کے سلسلوں سے سٹپٹا رہی ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ بڑے بڑے گھرانوں سے رشتے آ رہے ہیں، لوگ مجھے بڑا آدمی سمجھنے لگے ہیں، لیکن میں نہیں ہوں، اپنے اندر کے شاعر کو کئی بار پوچھا —— کیوں بھئی! کیا میں بڑا آدمی ہوں؟ اُس نے ہر بار نفی میں گردن ہلا دی!"

وہ دوبارہ گنگنانے لگا۔

میں نے شاعری کی روح کو چھونے کی کوشش کی۔

"اُس کا مطلب یہ ہوا کہ تم شادی کرو گے ہی نہیں۔"

"ایک منٹ میں کر لوں گا۔ بشرطیکہ اپنی طرح کسی چھوٹے گھرانے کی کوئی عام سی لڑکی مل گئی۔ عام سا آدمی ہوں اور تم جانتی ہو . . . . . ."

نوزر اونچی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ لیکن میرے کان بہرے ہو گئے تھے۔ دماغ ماؤف ہو گیا تھا، دل زور زور سے دھڑکنے لگا، نہ جانے مجھ پر کونسی کیفیت طاری ہو گئی، نہاں خانوں میں سوتے ہوئے کون سے جذبے کون سی تمنا نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ کسی الھڑ لڑکی کی طرح میرے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"میں بھی تو . . . . . . ؟"

میرا سر چکرانے لگا۔ جسم پسینے سے شرابور تھر تھر کانپنے لگا، سر سے ڈوپٹہ کھسک گیا، اُس نے مسکراتے ہوئے اپنے ہاتھ سے میرے سر پر ڈوپٹہ رکھا، اور اپنی آنکھیں موند لیں۔ میں پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے اُس کے ہونٹوں کو دیکھ رہی تھی، بڑی مشکل سے اُس کے ہونٹ ہلے، مدھم سی آواز نکلی۔

"میں جانتا ہوں، کب سے جانتا ہوں، تم سے بے پناہ پیار کرتا ہوں، میں بچپن سے . . . . ۔"

"نوزر"

میرے مُنہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

اُس نے آنکھیں موندے اپنی بات جاری رکھی۔

"سچ کہہ رہا ہوں، میں بچپن سے تمہیں دیکھ رہا ہوں، میری بہن کے

ساتھ تم کھیلی، اُس کے ساتھ جوان ہوئی۔ میرے دیکھتے دیکھتے تمام عمر سنور رہی ہے، میں نے تم سے اتنا ہی پیار کیا ہے .... جتنا اپنی سگی بہن سے۔ جب بھی میں نے تمہیں دیکھا، بچپن سے آج تک، سگی بہن کے ہی روپ میں دیکھا، جب بھی ملا ایک بھائی کے ناطے ملا۔ اپنی بہن کے ساتھ ساتھ تمہاری زندگی کے بارے میں بھی سوچا، آج تک، اس لمحے تک سوچ رہا ہوں، میں آج اماں سے یہی کہنے آیا تھا، اُس کے ممتا بھرے بڑھاپے کو ڈھارس بندھانے آیا تھا، میں تمہارے لئے ایک ایسا ہی ساتھی ڈھونڈ رہا ہوں، جو شاعر بھی ہو اور انسان بھی۔ کیونکہ تم خود ایک شاعرہ ہو۔ میری تلاش جاری ہے، ایک دن کامیاب ہو جاؤں گا۔ میں ہر تلاش میں کامیاب ہوا ہوں ......"

نور بھیا کی آواز بھر آئی۔ اُس نے آنسو اپنی آنکھوں میں ہی چھپا لئے۔ چہرے کی مسکراہٹ برقرار رہی، اُس نے میرے سر کو اپنی آنکھوں سے چوما اور چلا گیا۔

رات بھر اپنی اماں کے سینے سے لگی میں اپنی آنکھوں سے نہ جانے کیوں آنسوؤں کی بھیک مانگتی رہی، نہ جانے کیوں بنا خیال کے آنسو بہانے والی آنکھیں خاموش رہیں، شاید اُن کی بے سہارا زندگی کو حقیقی بھائی کا مقدس پیار مل گیا تھا۔

نلنی

نلنی

ایک معمولی سا مذاق میری زندگی کا سب سے اہم واقعہ بن گیا، ایک بہت ہی معمولی واقعے نے میری زندگی کی چال ہی بدل دی —— اتنی معمولی بات اور اتنا عجیب واقعہ —— میرے تصور میں یہ دونوں چیزیں کبھی نہ آ سکیں۔

میری کوئی کہانی کا لیج میگزین میں چھپ گئی۔ اس کہانی کو آگرہ کے ایک لڑکے رمیش نے پڑھ لیا —— اور ہماری قلمی دوستی کا پودا اُگ گیا۔ رمیش کے پہلے خط کو میں ابھی تک نہیں بھولا —— اُس نے لکھا تھا۔

"میں تم کو، تم سے اس لئے مخاطب کر رہا ہوں کیونکہ میں اور تم ایک ہی کلاس میں ہیں، تمہارا افسانہ زیادہ اچھا نہیں تھا لیکن پھر بھی نہ معلوم میں یہ خط تمہیں کیوں لکھ رہا ہوں اور مجھے ایک بات کا یقین ہے کہ تم میرا قلمی دوست بننے پر فخر ضرور محسوس کرو گے ——"

خط جتنا عجیب تھا اُس سے زیادہ مجھے لکھنے والا عجیب لگا اور میں نے بھی جواب اُسی انداز میں لکھا "میں تمہارا قلمی دوست بننے میں اس لئے فخر محسوس کر رہا ہوں کہ تم نے میرے افسانے کے متعلق عجیب ہی خیال ظاہر کیا ہے ——— سب لوگوں نے سراہا ——— اس لئے تم ان سب لوگوں سے مختلف ضرور ہو' اور ہاں تم کردار کے کچھ اچھے نہیں دکھائی دیتے' پھر بھی میں تمہارا قلمی دوست بن ہی جاؤں گا"

لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا رمیش ایک دوست ہی نہیں' ایک اچھا بھائی بھی ہے۔ میں نے اس کو یہاں آنے کی دعوت دی اور وہ فوراً ہی چلا آیا اور ہم نے بہت عرصہ اکٹھے گزارا ——— علاقے کا ایک ایک حصہ چھان مارا جس دن وہ واپس چلا گیا' میں رویا۔ دراصل ہم اتنے گھل مل گئے تھے کہ بچھڑنا کچھ عجیب سا دکھائی دے رہا تھا۔

آگرہ پہنچتے ہی اُس نے ایک خط لکھا جس میں اُس نے لکھا کہ اس کی چھوٹی بہن نلنی کسی لڑکی سے قلمی دوستی کرنا چاہتی ہے اگر میری نظر میں کوئی اچھی لڑکی ہو تو میں اس کا پتہ لکھ دوں۔

میں ایک عجیب ہی اُلجھن میں مبتلا ہو گیا' چند لڑکیاں میری ہم جماعت ضرور تھیں مگر نہ معلوم میں اُن کا پتہ دینا نہیں چاہتا تھا۔

پھر میں نے ایک عجیب سی بات کی، میں نے ایک فرضی' خیالی لڑکی پروین کا پتہ دے دیا۔ نلنی کا پہلا خط پروین کے نام آگیا اور میں نے کالج میں شافہ نامہ سے وہ اڑا لیا اور اپنی طرف سے پروین کے فرضی نام سے زنانہ ہینڈ

رائٹنگ میں جواب لکھ دیا۔ اب جب بھی کوئی خط آتا۔ وہ میں کالج شلف سے غائب کر دیتا ـــــ کالج شلف کو روزانہ دیکھنا اب میرا معمول بن گیا تھا۔

خطوں میں ہم بہت کھل گئے ـــــ میں نے پروین کے ایک رومان کی فرضی داستان بنا کر نلنی کو لکھی، مگر چند دن بعد اس کا جو خط آیا، وہ میری زندگی میں بہت ہی اہمیت رکھتا ہے، اس خط نے میرے دل میں ایک عجیب سی ہلچل پیدا کر دی، اُس نے لکھا تھا!

"پروین ـــــ میری زندگی میں ایک عجیب سا ٹھہراؤ آگیا ہے، ایک عجیب سی ہلچل مجھے چیخنے پر مجبور کر رہی ہے ـــــ ایک عجیب سی کشش مجھے رات بھر سونے نہیں دیتی، ایک عجیب سی چیز کی خواہش مجھے ہر وقت ہوتی رہتی ہے، کالج میں جب کوئی مجھے چھیڑتا ہے تو نہ معلوم مجھے کیوں مزا سا آتا ہے۔ کاش مجھے کوئی چاہتا ـــــ پروین میں کسی کے باہوں میں ڈولنا چاہتی ہوں ـــــ، مگر میں بزدل ہوں پروین بزدل ـــــ مجھ میں ہمت نہیں ـــــ میں معصوم ہوں، اندرونی آگ میں جل کر راکھ میں تبدیل ہو رہی ہوں، میں تو . . . . . "

نلنی نے اور بہت کچھ لکھا تھا، اُس رات میں سو نہ سکا، کاش میں نلنی کو اپنا تا ـــــ کاش میں نلنی کو لکھ سکتا، میں عورت نہیں مرد ہوں ـــــ اس کی ضرورت ـــــ اس کا پیار ـــــ اس کا مستقبل!

ـــــ

نلنی کے لئے میرے دل میں عجیب سی ہمدردی پیدا ہو گئی تھی، میں محسوس کرنے لگا کہ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گا —— کاش میں نے اپنا روپ بدل کر اسے خط نہ لکھے ہوتے —— مگر اب کیا ہو سکتا ہے!

زندگی کا ایک معمولی سا مذاق، ایک بہت ہی اہم معاملہ بن گیا تھا۔ میں نے پھر پروین کے نام سے خط لکھا، میں نے نلنی کو لکھا "نلنی کبھی میں بھی یہی محسوس کر رہی تھی —— تم راکھ بن رہی ہو، میں راکھ بن گئی ہوں، جس نے مجھے چاہا میں نے اُسے ٹھکرا دیا۔ جس کو میں نے اپنانا چاہا وہ مجھ سے بہت دُور نکل گیا۔ مگر اب میں مطمئن سی ہو گئی ہوں —— مجھے کوئی سہارا نہ ملے تو شاید میں پھر سپنوں کی وادی میں لوٹ جاؤں —— رہ گئیں پچھلی یادیں —— انہیں گردش کرنے دو —— جس دن یہ گردش ختم ہو جائے گی میری کائنات ہی ختم ہو جائے گی —— یہ یادیں ہی تو ہیں جن کے سہارے میں زندہ ہوں ——"

اور پھر ہماری خط و کتابت، انہیں منزلوں میں طے ہوتی رہی —— محبت، حُسن، جوانی —— یہ ہمارے خط تھے۔

نلنی کے لئے میری محبت کسی بھی دیوار کو پھاند سکتی تھی —— عزت، دولت، مذہب —— سب کچھ میں اس کے لئے قربان کرنے کو تیار تھا۔

اور پھر میں نلنی کے خط کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے اب کے بازی لگانے کا فیصلہ کیا۔ اِس بار اس کا خط آئے تو جواب میں اپنی اصلیت اُسے لکھ دوں گا۔

ایک ہفتہ
دو ہفتے
ایک مہینہ
نلنی کے خط کا نام و نشان ہی نہیں تھا۔
بے چینی ـــــ غم گینی ـــــ اُلجھن
پھر ایک دن اس کا خط ملا ـــــ آج میں خوش تھا ـــــ میں اس خط کو جلد از جلد پڑھ کر جواب لکھنا چاہتا تھا ـــــ وہ جواب جو نلنی کے لئے ایٹم بم سے کم نہیں ہو گا۔
مگر ؟ ـ
میں نے خط کھولا، میں آہستہ آہستہ پڑھنے لگا۔ میری رنگت تبدیل ہوتی گئی ـــ
اتنا بڑا مذاق !!
اُس نے لکھا تھا۔
"ڈیر روبن ڈیر ـــــ زندگی کا انوکھا تجربہ تمہارے سامنے ہے پردین کے سامنے، پروین آج میں تمہیں زندگی کی سب سے بڑی کہانی سنا رہی ہوں ـــــ یہ کہانی تمہارے لئے نئی ہے، عجیب ہے، مگر میں مجبور ہوں، بے حد مجبور ـــــ ہاں ذرا دل تھام کر سنو ـــــ
میں نلنی نہیں، میں رمیش ہوں ـــــ چونک گئیں ؟ ـــــ ہاں تمہیں یہ چونکنا ہی چاہئے ـــــ گھبراؤ مت ـــــ میں تمہیں سب کچھ لکھ دیتا

ہوں ـــ آج سے بہت پہلے میں نے رحمان سے کسی لڑکی کا پتہ مانگا اور
میں نے اُسے لکھا کہ میری چھوٹی بہن نلنی اس لڑکی سے خط و کتابت کرنا چاہتی
ہے۔ اُس نے مجھے تمہارا پتہ دیا ـــ اُس وقت میں نے یہ سب کچھ تفریحاً
کر دیا تھا۔ مجھے کیا معلوم، یہ تفریح میری زندگی کا خواب بن جائے گی۔

پروین میں تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں، بس اِس سے
زیادہ میں کچھ نہیں لکھ سکتا۔ میرا ہاتھ تھر تھرا رہا ہے، بس اِس کے
آگے کچھ نہیں لکھ سکتا، کچھ نہیں لکھ سکتا ـــ پروین ـــ فیصلہ اب
تم پر چھوڑ رہا ہوں

تمہارا ـــ رمیش۔

ایک خط ایک خواہش

ایک خط، ایک خواہش

تمہاری طویل، مختصر تحریر میرے دل کی کربد بن گئی۔ میری خوابیدہ بستی میں تم کیا آئیں کہ سوئے طوفان جاگ اُٹھے۔ میں نے برسوں سے جس غم و اندوہ کو اندر ہی اندر دبائے رکھا تھا تمہاری جھلک نے ہوا دے کر اُس میں پھر سے شدت پیدا کر دی۔ نغموں کی موت ہو چکی تھی۔ ستار کے تار ٹوٹ چکے تھے اور انہی شکستہ تاروں پر اچانک ضرب دے کر تم نے ان میں پھر سے ایک انتشار پیدا کر دیا۔ تم نے یہ کیا کیا، کیوں کیا؟! میری یادوں کو ہوا دے کر تم نے دوبارہ میرے من کی بے چینی، بے کلی اور بے آرامی میں ہلچل کیوں مچا دی۔ اور رہے سہے بچے کھچے سکون کو متلاطم کر کے رکھ دیا۔ آہ! کاش تم کچھ جان سکتیں — تمہاری ملاقات نے مجھے درد دیا تھا۔ تمہاری تحریر نے مجھے اس درد کی دوا دی۔ اس دوا نے جو زندگی بخش تڑپ مجھ میں جگائی ہے اُسے تا ابد بنائے رکھوں گا

گذرے ہوئے لمحات میرے لئے بہت ہی جاں گسل اور جان لیوا رہے ہیں

اور میں آج تک . . . . میں آج تک اس درد کی شدت کو فراموش نہ کر سکا۔ اور کروں بھی کیسے یہ چیزیں تو اب میری زندگی بن چکی ہیں۔ ہاں ـــــ لاکھوں جتن اور سالہا سال کے صبر و شکیب کے بعد میں قدرے اس قابل تو ہوا تھا کہ اپنے دکھ اور شدید احساس میں کچھ کمی تو کر سکوں۔ لیکن کٹھنتا کا یہ دور تمہارے دیکھنے پر پھر شروع ہوا۔ دم گھٹنے سا لگا دل کی دھڑکنوں میں دلی ہیجان پھر سے بڑھتا جا رہا ہے۔ اور وحشت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میرے زخموں کے ٹانکے پھر سے کھل گئے ہوں۔ دل کے ناسور میں پھر سے ٹیس شروع ہو گئی ہوں۔ اور میں محسوس کر رہا ہوں کہ میں بڑی سرعت، بڑی تیزی کے ساتھ ماضی کے اس پُر ماحول، پُر درد اور کربناک سٹیج کی طرف پھر سے سرکتا جا رہا ہوں جس میں سے نکلنے کے لئے میں نے اپنی ساری قوت ساری شکتی صرف کر دی تھی!

تمہاری ہمدردانہ، پُرخلوص اور پیار بھری تحریر نے آج میرے سامنے پھر ماضی کی تاریخ کھول کر رکھ دی۔ جسے میں بھول جانا چاہتا تھا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دبی یادیں۔ پر وحشت یادیں پھر تازہ ہو کر میرے دل و دماغ پر چوکے دے رہی ہیں۔ اور مجھے آج وہ سماں یاد آ رہا ہے۔ جب سنیما میری زندگی میں داخل ہو گئی۔ تم نے ٹھیک ہی لکھا ہے۔ میں نے نیما کو نہیں دیکھا، میں خود بھی تمہاری نیما نہیں بن سکی۔ حالانکہ کوشش کی ہم دونوں نے کچھ بلنے کی۔ لیکن زمانہ کہاں کسی کو بننے بنانے کا موقع دیتا ہے۔!

یہ حقیقت ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ میں نے تمہیں نیما کی کہانی نہیں سُنائی
تم نے نام سُنا تھا اور شاید میری آنکھوں میں اُس کی پرچھائیں دیکھ لی تھی۔
لیکن آج میں تمہیں اپنے ماضی کی ایک بھولی بسری یاد کی دھڑکنیں سنانے
کی جسارت کرتا ہوں...... مٹی ہوئی یاد ہے، ایک ڈوبی ہوئی
کہانی ہے ــــــــ ایک زمانہ بیت گیا ــــــــ اُن دنوں میں نے
کالج میں نیا نیا داخلہ لیا تھا۔ موسم خزاں کی دھند میں لپٹی ہوئی ایک صُبح تھی
کالج روڈ پر ابھی بہت کم آمد و رفت شروع تھی، میں اپنی دُھن میں مست
آہستہ آہستہ کالج کی طرف جا رہا تھا۔ بالکل خالی الذہن سا ہو کر چل رہا تھا
لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ آنے والا لمحہ میری زندگی کے لیے کس قدر ہیجان،
کس قدر انقلاب لئے ہوئے ہے، گرلز کالج کے قریب پہنچکر میرے قدم خود
بخود رُک گئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے سڑک نے میرے پاؤں مضبوطی سے
تھام لئے ہوں۔ میں نے دیکھا کہ اس سے کچھ دُور سیاہ چمکیلے برقعے میں ایک
لڑکی سمت مخالف سے تیزی سے چلی آ رہی ہے۔ ہیولائی صورت میں نہ جانے
ایسی کونسی کشش تھی کہ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ میری نگاہیں ایک انجانی
کشش سے اُٹھی کی اُٹھی رہ گئیں۔ آہ! وہ اس کے چلنے کا انداز!! اور
پھر جب وہ مستور میرے نزدیک پہنچی تو میری نظریں غیر اختیاری طور پر اس
کے چہرے کے مخملیں نقاب پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ اور دوسرے ہی لمحہ میں سیاہ
جالی کے دو سوراخوں کے عقب میں دو نیلگوں چشموں کی عمیق گہرائیوں میں
ڈوب گیا۔ اُف اُن آنکھوں میں کتنی کشش تھی۔ اور جب سیاہ جالا ہیں

چھپی ہوئی دل کو گرما دینے والی دو آنکھیں میری نگاہوں سے ٹکرا گئیں تو میں لرز سا اُٹھا۔ نہ جانے میں کیوں کھو سا گیا!

وہ کالج کے اندر چلی گئی۔ اس طرح جس طرح کوئی ساحرہ اپنے طلسم آلودہ جلوے بکھیرتی جاتی ہے۔ اور میں دُور اس کی غائب ہوتی ہوئی مبہم سی جھلک کو دیکھتا رہا۔ کالج پہنچ کر میں عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا۔

"وہ کون تھی —— ارے ہُوں ہی ہوگی کوئی ——" میں نے سوچ لیا ——، مگر نہیں ——، میں رات بھر نہ سو سکا۔ مجھے ایسا دکھائی دیا جیسے ساری رات کانٹے میرے جسم سے کھیلتے رہے ——!

دوسری صبح میں حسبِ معمول پھر اسی راستے پر چل پڑا۔ مگر میں چونک پڑا؟ —— آج اس نے برقعہ نہیں پہنا تھا۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ چلی آرہی تھی، میں نے اُس کو اس کی پُر اسرار آنکھوں سے پہچان لیا اور وہ چلنے کا مخصوص انداز، بھلا میں اس کو بھول سکتا تھا۔

اب روز کالج گیٹ کے باہر اس کا انتظار کرنا میرا معمول بن گیا۔ میں روز ہی اس کو دیکھتا رہا۔ وہ روز ہی میری طرف ساحرانہ نگاہ ڈال کر کالج میں داخل ہو جاتی۔ جب وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا پڑتی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے میرے دل کے تار مسکرا پڑے ہوں۔

اور ایک دن وہ مجھے نیا کشمیر پارک میں دکھائی دی۔ وہ تنہا چنار کے نیچے کوئی کتاب پڑھنے میں محو تھی۔ میرے قدم خود بخود اس کی طرف بڑھنے لگے!

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔" میں غیر اختیاری طور پر کہہ اٹھا۔
"جی بیٹھیئے —" وہ چونک پڑی۔

یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ میں دیر تک اس کے قریب بیٹھا رہا۔ اس کی طرف دیکھتا رہا— وہ کتاب پڑھتی رہی۔ کبھی کبھی میری طرف نظر اٹھا کر دیکھتی اور مسکرا دیتی۔ وہ چلنے لگی —" اب کب ملاقات ہوگی۔" میں نے پوچھا۔

"جی۔ جی میں روز ہی شام کو چند لمحوں کے لئے یہاں آجاتی ہوں۔۔ ۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی اور چل پڑی!

اب روز ہی میں نیا کشمیر پارک جاتا وہ روز ہی وہاں ہوتی — ہماری ملاقاتیں بڑھتی گئیں۔ شاعری سے اس کا جنوں کی حد تک لگاؤ تھا۔ شعر و شاعری پر ہماری باتیں ہوتی رہتی اور ایک دن ہماری یہی باتیں، ہماری یہی ملاقاتیں پیار و محبت میں بدل گئیں!

نیما میری زندگی میں داخل ہونے والی پہلی لڑکی تھی اور جب کوئی لڑکی کسی نوجوان کی زندگی میں داخل ہونے والی پہلی لڑکی ہوتی ہے تو وہ نوجوان بری طرح بوکھلا اٹھتا ہے۔ اس کی سوچنے سمجھنے کی تمیز رخصت ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنا سارا ماحصل اسی لڑکی کو سمجھنے لگتا ہے — نیما — نیما کو پاکر مجھے سب کچھ مل گیا۔ مجھے وہ سب کچھ مل گیا۔ جس کی میں نے تمنا کی تھی۔ اس کی چاہت معصوم اور بے لوث تھی۔ میں نے کیا کیا حسین محل نہ بنائے بہاروں کے تصور میں کیا کیا پھول نہ کھلائے۔ میں نے اپنے سپنوں میں رنگینی

ہی رنگینی بھر دی۔ دن گزرتے گئے۔ محبت پروان چڑھتی رہی۔ لیکن حالات نے میرا ساتھ نہ دیا۔ زمانے کو میری خوشیاں نہ بھائیں۔ مجھ سے میری زندگی کا سہارا چھن گیا۔ مجھے کالج چھوڑنا پڑا اور حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر کلرک بننا پڑا۔ سو روپے کا ایک معمولی کلرک۔ دن بھر فائلوں میں سر کھپانے کے بعد جب میں نیما سے ملتا تو وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ سے میرا استقبال کرتی اور جب میں اپنی بے بسی کا رونا روتا، وہ کہتی —— میں نے تم سے محبت کی ہے —— ایک کلرک سے نہیں —— تم کچھ بھی ہو میرے لئے تو پریتم ہو، اپنے پریتم۔"

جب میں نے نیما کے ساتھ اپنی شادی کا پیغام بھجوایا تو اس کے ٹھیکیدار باپ نے یہ پیغام اس لئے رد کر دیا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی ایک معمولی کلرک سے نہیں کر سکتا۔ جیسے کلرک انسان نہیں ہوتا۔ جیسے اس کا دل نہیں ہوتا۔ وہ محبت نہیں کر سکتا اور اس کی خواہشات اور تمنائیں نہیں ہوتیں۔

. . . . . اور حالات نے میری نیما کو مجھ سے چھین لیا۔

میری مسکان مجھ سے روٹھ گئی۔ سپنے بکھر گئے۔ محل کھنڈروں میں بدل گئے۔ نیما کسی اور کی ہو گئی۔ اس وقت میری سوچیں ناپختہ شعور کی سوچیں تھیں۔ جو کسی نتیجے پر نہ پہنچتیں۔ میں سوچتا رہا۔ اپنے بارے میں نیما کے بارے بلکہ مستقبل کی زندگی کے بارے میں۔ میری سوچ کہیں بھی نہ پہنچی۔ نیما دوسرے گھرانے میں، کسی دوسری زندگی میں پہنچ گئی۔ پہلی محبت تھی۔ دھندلکوں

میں دیکھتے دیکھتے گم ہو گئی تھی تو اپنی زندگی تاریک ہو گئی۔ تاریکیاں آنسو
لائیں۔ افسردگیاں لائیں۔ اور میں نے اپنی زندگی کو اسی ڈگر پر ڈال دیا جو موت
کی سمت بڑھتی ہے۔ وقت گزرتا گیا۔ تاریکیاں موت کا قرب حاصل کرتی گئیں
اب میری زندگی سپاٹ تھی۔ [illegible] وسیع صحرا کی طرح۔ دور بہت دور ایک
دیا جل رہا تھا۔ اب یہی ایک رشتہ تھا۔ جسم اور روح کی وابستگی کے لئے۔
دو سال گزر گئے۔ محبت کی اس ناکامی نے مجھے داغدار بنا دیا۔ مجھے عورتوں
سے نفرت ہو گئی۔ اس ماحول سے نفرت ہو گئی جہاں ایک کلرک محبت نہیں
کر سکتا۔ اس دنیا سے نفرت ہو گئی جو جھوٹ کا ایک پلندہ ہے۔ ایک گھناؤنی
صورت خوبصورتی کا حسین لبادہ اوڑھے ہوئے۔ میری روح میرے احساسات
بری طرح مجروح کر دیئے گئے۔ مجھے اپنی ذات سے نفرت ہو گئی جو صرف
سوچنے کی عادی ہے۔ سوچتے سوچتے مر جانے کی جستجو میں ہے۔

میری تمنائیں مر چکی تھیں۔ زندگی دم توڑ چکی تھی۔ اور اب میں حسرتوں
اور محرومیوں کی لاشیں اپنے سینے کے مدفن میں دبائے مصنوعی زندگی سے
نباہ کر رہا تھا کہ اچانک اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک حسین اور معصوم
چہرہ مشعل بن کر چمکا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے تم پھر زندہ ہو گئی ہو۔ وہ میرے
سامنے ہے۔ اور مجھے بلا رہی ہو۔ وہی رنگ وہی روپ، وہی ملائمت، وہی
تمکنت، وہی وقار، وہی معصومیت ـــ سب کچھ وہی!! مگر یہ تمنا
نہیں ـــ تم تھیں ـــ ادما ـــ تم ـــ!!!

تم اچانک میرے قریب آ گئیں اب میں سوچتا ہوں۔ اگر میں کلرک نہ

ہوتا تو تم نوکری کی تلاش میں میرے دفتر نہ آتیں۔ اور اگر میں اس دفتر میں کلرک نہ ہوتا تو تم کبھی میرے قریب نہ آتیں۔ کم سے کم مجھے اپنے پیشے سے پیار ہونے لگا۔ میری اُجڑی ہوئی زندگی کے لئے یہ احساس حوصلہ افزا تھا۔ کچھ کر گزرنے کی تحریک بخش سکتا تھا۔ لیکن میں جانتا ہوں اوما تم خود کتنی دکھی ہو، دکھی ہو کر بھی میری ڈھارس بندھا رہی ہو۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے نیما میرے کانوں میں کہہ رہی ہو — میں تمہارے سامنے ہوں ور جب میں اپنی آنکھیں اُٹھاتا ہوں تو تمہیں اپنے سامنے پاتا ہوں۔ تنہائیوں میں تم میرے دل کی عمیق گہرائیوں میں دبے پاؤں چلی آتی ہو۔ ایک میٹھا سا پر کیف درد بن کر۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تم میرے زخموں پر پھاہا لگا رہی ہو۔ اور میں ایک سکون سا پاتا ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تم میری جنم جنم کی ساتھی ہو۔ ایک ایسا ساتھی جو پچھلے جنم میں مجھ سے بچھڑ گیا ہو۔ اور اس زندگی میں مجھے پھر ملا ہے — نیما کے روپ میں، اوما کے روپ میں۔ پھر اچانک میرے سکون میں ایک ارتعاش سا پیدا ہو جاتا، ایک خوف ایک گھبراہٹ سی طاری ہو جاتی کہ کہیں تم پھر میرا ساتھ نہ چھوڑ دو۔ مجھے بے سہارا نہ چھوڑ دو — میرا ہاتھ نہ جھٹک دو — اسی خیال سے میں کانپ اُٹھتا — اُف یہ خیال میرے لئے کتنا روح فرسا، کتنا اذیت ناک تھا۔ اور میں اس خیال کے آتے ہی پھر غم و اندوہ کی عمیق گہرائیوں میں ڈوب جاتا۔ اگر تم مجھے چھوڑ کر چلی گئیں تو میں غم کے اس گہرے ساگر سے شاید ہی کبھی اُبھر سکوں گا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں جیسے پکارتی سنائی دیتی

ہیں - ایسا نہیں ہوگا - ایسا کبھی نہیں ہوگا -

تمہاری باتیں مجھے رہ رہ کر یاد آتی ہیں - اُن باتوں میں زندگی کا پیار تھا - پیار کی حقیقت تھی - تم نے مجھے زندہ رہنے کی تحریک بخشی تھی - دُکھ سُکھ، شکست و فتح سے نباہ کرنے کا حوصلہ دیا تھا - یہی زندگی ہے یہی احساس ہے جو زندگی کو حسین بناتا ہے - میں نے تمہیں پا کر بہت کچھ حاصل کیا، تمہیں کھو کر میں نے زندگی کا حقیقی لب و لہجہ پالیا - میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گا - زندگی کے کسی موڑ پر کسی منزل پر بھی نہیں ---!

آدما تو مجھے غلط نہ سمجھنا - حالات نے مجھے بہت ہی جذباتی بنا دیا ہے - یہ میرے دل کی آواز ہے - تمہاری ڈھارس اور تمہاری ہمدردانہ تحریر نے تمہارے خلوص اور پیار نے آج بہت مدت کے بعد میری اس آواز کو کُریدا ہے - کسی کو اپنا ہمدرد پاتا ہوں - تو بے اختیار جھک جاتا ہوں - اور تم نے تو مجھے زندگی دی ہے - مجھے میری آتما واپس دی ہے - کہیں اس دی ہوئی زندگی کو اس لوٹائی ہوئی آتما کو واپس نہ چھیننا -

تمہاری مختصر طویل تحریر کا ایک ایک لفظ درد میں ڈوبا ہوا ہے اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی نے میری طرح تجھے بھی درد اور تلخیوں کے سوا کچھ نہیں دیا ہے پھر کیوں نہ درد کو درد سے ملنے دیا جائے - دو درد بھرے دل مل جائیں گے تو مدھرتا کی ایک نئی گنگا بہنے لگے گی - تلخیوں میں تلخیاں مدغم ہو کر مدھرتا کے جھرنے پھوٹنے لگیں بے چین روحوں کو شانتی ملے ایک لازوال شانتی! پھر نغموں کی موت نہیں ہوگی - روحوں کا

خون نہیں ہوگا۔ خلوص اور پیار کی جیت ہوگی۔ غم ہار جائیں گے۔ اندھیرے شکست کھائیں گے اور اجیارے فتح پائیں گے۔

مگر آج میں سوچ رہا ہوں اگر تم نہ ہوتیں تو۔ شاید میری زندگی میں اتنی تلخی ہوتی، وہی برا اتنا غم ہوتا صرف اس لئے کہ میں جس ماحول میں رہتا ہوں وہ مردہ ہے۔ بے جان ہے۔ اور اس ماحول میں وہی رہ سکتا ہے جس کے پاس دل نہ ہو۔ میرے پاس ایک دل ہے۔ دل کا دیا ہوا ایک درد ہے۔ آج تک میں سوچتا رہا یہ درد، یہ دکھ ہمیشہ کے لئے یہیں رہے گا۔ ہمیشہ میرے جسم کے ساتھ چپٹ کر رہ جائے گا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اندھیرے میں مجھے ٹمٹماتا چراغ دکھائی دے گا ——!

میں نے نظر دوڑائی، مجھے تم ملیں، تم سے زیادہ تمہارا خلوص ملا۔ تمہاری ہمدردی مل گئی۔ تمہاری محبت مل گئی۔ میں ٹھہرا ادیب، پیار کا بھوکا۔ ہمدردی سے بے نیاز۔ ہمیں پیار کا ایک لفظ ملا ہم بک گئے۔ ہم جو کچھ لکھتے ہیں دوسروں کے لئے لکھتے ہیں۔ ہمیں کیا ملتا ہے ایک حقیر کتے کے سامنے جس طرح ہڈی پھینکی جاتی ہے اسی طرح چاندی کے چند کھنکتے سکے ہمارے آگے ڈالے جاتے ہیں۔ ہم اپنا ذہن، اپنے خیالات، اپنا تخیل فروخت کر دیتے ہیں!!

اوما تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے، اس زندگی کو زندہ رکھنا تمہارا فرض ہے۔ میں جانتا ہوں تم مجبور ہو، تمہارے جذبات دورا ہے پر کھڑے ہیں۔ . . . . . . تم شادی شدہ ہو، تم اپنے پتی کو دھوکہ نہیں دے سکتیں

تم اپنے معصوم بچے کو دغا نہیں دے سکتی !! میں بھی چاہتا ہوں کہ تم ان چیزوں کو نبھائے رکھو۔ مگر خدا کے واسطے مجھ سے میرا سہارا نہ چھینو۔ مجھے ہمیشہ کی طرح اپنے خلوص، ہمدردی اور محبت سے نوازتے رہو۔ میں پیار کا بھوکا ہوں !!!

تم نے ٹھیک ہی لکھا ہے —" پیار ہمارے ارادوں کی تکمیل کا نام نہیں۔ دو جسموں کے ملاپ کا نام نہیں — پیار نام ہے ایک جستجو کا۔ جو کبھی مکمل نہیں ہوتی۔ ایک دُنیا کا جو صرف دُور سے دکھائی دیتی ہے۔ اِس کا لمس حاصل نہیں ہوتا ایک احساس کا جو بن بن کر مٹتا ہے۔ لیکن کبھی فنا نہیں ہوتا — کیا ہم دونوں کا پیار اِس کسوٹی پر پورا نہیں اُترتا ؟ !"

. . . . اگر یہی پیار ہے تو میں نے پا لیا۔ تمہاری بدولت مجھے اُس کا قُرب حاصل ہُوا۔ میں تمہارا احسانمند رہوں۔ تمہارے اسی پیار نے مجھے کہانیاں دیں اور میری کہانیوں نے شکست خوردہ لوگوں کو پیار اور پیار کا حوصلہ — میرا پیار امر ہے ایک خوش آئند مستقبل کی خواہش اپنی مقدس جھولی میں سنبھالے ہوئے — اور آج جب خط نے میرے دل کی دھڑکنوں میں ایک خواہش جگائی۔ عجیب سی خواہش کہ میرے مستقبل کی خواہشوں کی کبھی تکمیل نہ ہو — میری زندگی سراپا ایک تلاش بن جائے۔ ایک جستجو بن جائے !!! — میری تمنا مجھے کبھی نہ ملے، میری آشا مجھے کبھی دکھائی نہ دے — میرا پیار ہمیشہ ادھورا رہے !!!

میری آرزو، تیری تمنا

میری آرزو، تیری تمنا

ستار کے تاروں کو اپنی اُنگلیوں سے چھیڑتے ہوئے شانتا سوچنے لگی۔

آخر ایک مختصر سی بے معنی تحریر میں ایسی کون سی بات ہے جس نے اُسے بے چین رکھا ہے۔ ایک انجانے ان دیکھے مداح کی تحریر ہی تو ہے۔ ایسی تو کئی تحریریں اُس کی آنکھوں نے پڑھی ہیں۔ اور مسکرا کر پھینک دی ہیں۔ آواز کے شیدائی، سنگیت کے پرستار اور گیتوں کے سودائی اکثر اُسے خط لکھتے رہتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ تو پھر یہ بے چینی کیوں؟ یہ گھُٹی گھُٹی سی بے قراری کیوں؟ اُس نے غیر شعوری طور پر یکبارگی تاروں کو زور سے جھنجھوڑا۔ لیکن کوئی نئی بات ضرور تھی۔ وہ خط ایک عجیب سی تحریر تھی۔ وہ تحریر الفاظ کا ایک عجیب سا مجموعہ تھی۔ سوتے میں بھی وہ الفاظ اُس کے کھوئے کھوئے خیالوں میں تھر کتے رہے۔ صبح جاگی جب بھی تحریر کے حروف

اُس نگاہوں کے سامنے ہمک رہے تھے۔ ستار لے کر ریاض کرنے بیٹھی تب بھی خط کے حروف تاروں کی آواز اُلجھتے رہے۔ جیسے کسی بے آواز گیت کے بول ہوں۔ جو اُس کے سُریلے ہونٹوں کا لمس حاصل کر کے اپنا ازلی و ابدی سنگیت پا لینے کی جستجو میں ہوں۔ اُس نے ستار کو دیوار کے سہارے رکھا اور خط کو پھر پڑھنے لگی۔

سنگیت کی دیوی!

ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی رہیں گے۔ یہ جانتے سمجھتے ہوئے بھی کسی اجنبی سے احساس کے لمس سے مجبور ہو کر آپ سے مخاطب ہونے کی جسارت کر رہا ہوں۔ مختصر یہ کہ میں آپ کی آواز کا مداح ہوں۔ جب کبھی بھی ریڈیو پر آپ کی مدھر آواز سُنتا ہوں، کھو سا جاتا ہوں۔ یقین مانئے اِس کھونے اور پانے کی تگ و دو میں کسی ایسی ویسی چاہت یا محبت کا دخل نہیں۔ اور پھر چاہت میرے لئے ایک عجیب سا لفظ ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں صرف ایک بار اس لفظ کو اپنایا ہے۔ بس ایک دوڑ تھی۔ بے منزل کی دوڑ۔ طویل اور کٹھن۔ میں اُس دوڑ میں تھک کر بھی نہیں رہا را۔ لیکن زمانے نے اور زمانے کے ہاتھ میں کٹھ پتلی وقت نے مجھے ہار نے پر مجبور کر دیا۔ میں ہارا نہیں تھا۔ مجھے ہرایا گیا۔ ایک عجیب سی داستان ہے لیکن وقت نے، وقت کے زمانے نے اُسے عام سا بنادیا ہے۔ اور عام سا بنادیا ہے۔ اور عام سی کہانی کو دہرانا فضول ہے۔ اور پھر اِس زندگی میں ہزار کوشش پر بھی شاید ہی اپنی وہ پہلی چاہت اور چاہت کی وہ پہلی محبت

کسی اور کو دے سکوں۔ ایک بھولی بسری یاد ہے جو میری آج کی زندگی کی سانسوں کی تمنا ہے۔ کسی کی ڈوبی ہوئی دھڑکن کی آواز کی آرزو ہے۔ معاف کیجئے، جذبات کی رَو میں بہہ گیا۔ اور تحریر نے غلط ڈگر اپنالی میرا مقصد اپنی پریشان داستان سنانا نہیں ہے۔ مجھے تو آپ کی صرف پرکشش آواز کے بارے میں باتیں کرنی ہیں۔ کیونکہ آپ کی آواز میری اُس زندگی کی دھڑکنوں سے بالکل ملتی جلتی ہے۔ جو مجھ سے دُور ہو گئی۔ اتنی دُور کہ خیالوں کی پرواز بھی اُس کا لمس نہیں پا سکتی۔ لیکن میرے دل میں مدتوں بعد ایک آرزو جاگی ہے۔ ایک تمنا اُبھری ہے کہ میں آپ کی آواز کا قرب حاصل کروں صرف ایک بار، صرف ایک بار میں آپ کی آواز کو قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اُس میں میرا ماضی ہے۔ میرے ماضی کی یادیں ہیں۔ میرے ماضی کو ساتھ لے کر، میرے ماضی کی یادوں کو ساتھ لے کر کبھی نہرو پارک میں آیئے۔ کسی شام کو آ جایئے۔ میری اُداس دُھندلی سی شاموں کا یہی ٹھکانہ ہے۔ ہر شام کو وہیں ہوتا ہوں۔ وہیں بیٹھا عہدِ رفتہ کا انتظار کرتا ہوں۔ ایک مدت سے . . . .

آپ کی آواز کا مدّاح

؟ ؟ ؟

اب کی بار خط پڑھنے کے بعد شانتا زیرِ لب مسکرائی۔ پھر ستار لے کر بیٹھ گئی۔ ستار کے تاروں میں سے مدھم سی آواز پیدا کرتے ہوئے اُس نے اپنے من ہی من میں فیصلہ کر لیا کہ وہ شام کو نہرو پارک جائے گی۔ اور اپنے ایک

خبطی اور سر پھرے مداح سے ملے گی۔ پہچاننے کی کوشش کرے گی۔

شام کو وہ نہرو پارک میں گئی۔ خوشگوار شام تھی۔ خوشگوار موسم تھا۔ خوشگوار گہما گہمی تھی۔ ہر ایک کا ایک ساتھی تھا۔ صرف وہ اکیلی تنہا تھی کوئی ساتھی نہ تھا، کوئی جاننے پہچاننے والا نہ تھا۔ اُس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ ہریالے سبزے پر دوڑتی، رنگ برنگ کے پھولوں کو چومتی نظریں ایک دم ٹھٹک گئیں۔ ٹھٹک کر ایک موڑ پر مرکوز ہو گئیں۔ سانسیں تیز ہو گئیں۔ سب سے دور، سب سے الگ ایک لڑکا فلسفی بنا بیٹھا تھا۔ سر کے لمبے لمبے بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ گلے میں ڈھیلی سی ٹائی لٹک رہی تھی۔ چہرے سے ایک آوارہ سی اُداسی ٹپک رہی تھی جیسے بہت دُکھی اور پریشان ہو۔ سوٹ قیمتی تھا۔ لیکن پہننے کا سلیقہ نہ تھا۔ آنکھیں موٹی موٹی تھیں۔ لیکن دیکھنے کا انداز نہ تھا۔ اپنے خیالوں میں کھویا خاموش بیٹھا تھا۔ شانتا آہستہ قدم اُس کے پاس پہنچی۔ قریب سے اُسے دیکھا۔ انتظار کا کرب کہیں بھی نہ تھا۔ انتظار جس اضطراب کا غماز ہوتا ہے وہ کہیں بھی نہ تھا۔ شانتا کی نگاہوں کے سامنے خط کے حروف کسمائے تحریر انہی ہاتھوں کی تھی۔ شانتا نے جیسے اکیلے میں کسی گیت کے بول مدھم آواز میں گنگنائے۔

"مجھے شانتا کہتے ہیں"

اُس نے چونک کر اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے شانتا کو دیکھا۔ آنکھیں جھپکا کر کچھ سوچا۔ زبان خاموش رہی۔

"کیا آپ ——!؟"

شانتا کے ہونٹ کانپتے رہے۔ وہ جا چکا تھا ——!

عجیب سی بات تھی۔ وہ خط، سنگیت کی دیوی —— آوارہ کا ایک مداح اور پھر یہ واقعہ!؟ —— وہ اُنہی قدموں لوٹ آئی۔ لڑکا وہی تھا۔ اُس کی تحریر میں اُس کے آوارہ خدوخال صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ہو سکتا ہے کوئی پاگل شاعر ہو۔ ہو سکتا ہے کوئی --!؟

اُس نے سونے سے پہلے خط کو پھاڑ کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ پھر ایک شام اچانک ایک دوسرا خط ملا۔ تحریر اور تحریر کے حروف جانے پہچانے اور دیکھے بھالے تھے۔

شانتا دیوی!

بے حد شرمندہ ہوں۔ درحقیقت میں آپ کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ میری سوچیں ہی ختم ہو گئیں۔ زبان ہی گنگ ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ میں پشیمانی کا مظاہرہ کروں، معذرت چاہوں، میں مختصر الفاظ میں اپنے دل اور دماغ کی پریشانی بیان کرنا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ بغیر معذرت چاہے آپ مجھے معاف کر دیں۔ ہو سکتا ہے کہ ....

پرانی بات ہے میں لکھنؤ میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ سنجیدہ ماحول میں ایک گمبھیر سی لڑکی کا قرب حاصل ہوا۔ قرب نے ملاقاتیں بخشیں۔ ملاقاتوں نے محبت بخشی۔ ایک ایسی محبت جس میں کلیوں کی پاکیزگی

اور ایک کنواری لڑکی کے مقدس خیالوں کا رس ہوتا ہے۔ وقت اپنا تھا۔
ماحول اپنا تھا۔ ہم نے جیون ساتھی بننے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن ہمارا فیصلہ
شاید قدرت کو منظور نہ تھا۔ یکبارگی ایک مسموم آندھی چلی، ایک برق
آلود طوفان اُٹھا۔ اور چاروں طرف فسادات کی آگ بھڑکنے لگی۔ لوگ
پاگلوں کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگنے لگے۔ اپنوں سے بھاگ
کر غیروں کو اپنانے لگے۔ اُس بھیانک بھاگ دَوڑ میں اپنے پرائے ایک
دوسرے سے بچھڑ گئے۔ ہم بھی بچھڑ گئے۔ بچھڑے ہوئے ہو سکتا ہے
کبھی کہیں زندہ یا مُردہ ملے ہوں۔ لیکن مجھے وہ لوگ نہیں ملے۔ آج تک
نہیں۔ شاید اب کبھی نہ ملیں۔ جینے کے لئے بہت سی باتیں بھُولنا پڑتی
ہیں۔ میں بھی بہت کچھ بھول گیا۔ ایک حادثہ تھا۔ جس کے زخم مندمل
ہو چکے تھے۔ زخموں کے نشان تھے۔ درد جگانے سے قاصر تھے۔ لیکن یہ میرا
واہمہ تھا۔ اُنہوں نے پھر درد جگایا۔ میں نے ایک دن ریڈیو پر ایک
آواز سُنی۔ میری اپنی ہی آواز تھی۔ جو کسی کو پُکار رہی تھی۔ اپنے پاس بُلا
رہی تھی۔ میں نے غیر اختیاری طور پر چند سطریں لکھ ڈالیں۔ انجام سے
بے نیاز، ایک عجیب سی حالت میں۔ نہ جانتے ہوئے بھی کہ میں انتظار
کروں گا۔ اور آپ آئیں گی۔ میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں آپ کی آواز
نے ایک وہم ضرور پیدا کیا۔ کہیں شانتا میں ارملا تو نہیں چھُپی بیٹھی کہیں نئے
ماحول میں ارملا نے اپنا نام شانتا تو نہیں رکھ لیا۔ لیکن آواز میں اور آپ
میں بڑا فرق تھا۔ آپ ارملا نہ تھیں۔ حالانکہ میں اب بھی وہی تھا۔ وہی——

اور اب میں ہوں اور نہرو پارک —— شام کے وقتی ہنگاموں میں اپنی راتوں کی ابدی تنہائیاں ڈھونڈھتا پھرتا ہوں۔ وقت کتنا بدل گیا ——!

بہرحال اپنی ناشائستہ حرکت پر نادم ہوں اور معافی کا خواستگار!
ایک شکست خوردہ انسان

؟؟؟

خط کیا تھا، ایک درد بھری منظوم کہانی تھی۔ جسے گا کر بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ البتہ ستار کی آواز میں اُسے ڈھونڈا جا سکتا تھا۔ شانتا کو اُس سے ہمدردی سی ہو گئی۔ وہ اُس کا نام تک نہ جانتی تھی۔ پھر بھی ایک شام اُس سے ملنے نہرو پارک گئی۔ سماں اپنے جوبن پر تھا! مخصوص رنگ اور انداز میں تھا۔ اپنے مخصوص تنہا گوشے میں وہی لڑکا بیٹھا تھا۔ خاموش۔ موٹی موٹی آنکھوں میں اب کی بار انتظار کا اضطراب صاف دکھائی دے رہا تھا۔ شانتا کو دیکھ کر وہ خوشی سے چمک اُٹھا۔

"آپ؟"

شانتا اُس کے قریب بیٹھ گئی۔

"آج تو آپ کی سوچیں کام کر رہی ہیں نا؟"

وہ اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کی خاموش نگاہیں شانتا کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ شانتا نے بات بڑھائی

"کچھ بھی ہو، آپ کو اپنی ذات کا خیال رکھنا چاہئے چہرے مُہرے

سے اچھے خاصے دکھائی دیتے ہیں۔ ذرا سی ترتیب بہت کچھ بدل سکتی ہے
دل اور دماغ کی زردیاں دُور کی جا سکتی ہیں۔ آپ کی کہانی زرد ناک
ضرور ہی ہے۔ لیکن انوکھی نہیں۔ عام سی کہانی ہے۔ کئی لوگ اُس کا کردار
بنے۔ لیکن سب زندہ ہیں!"

اُس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ لیکن ہونٹ خاموش رہے۔
شانتا نے اُس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے قدرے اونچی
آواز میں کہا ——

" دیکھئے یہ خاموشی مجھے اچھی نہیں لگتی۔ خاص ڈھنگ سے جو خط لکھ
سکتا ہے وہ خاص ڈھنگ سے بول بھی سکتا ہوگا۔

اُس نے اپنے ہونٹوں کو جُنبش دی۔
" اکیلا تنہا آدمی آخر باتیں بھی کس سے کرے؟"
شانتا نے اُسی رَو میں کہا۔
" وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن کوئی بھولا بھٹکا زندگی کے کسی کنارے مل
ہی جائے تو اُس سے باتیں کرنے میں کیا حرج ہے؟"
اُس نے اپنی کہی۔
" آپ کی آواز نے غلط فہمی میں ڈال دیا۔ بغیر سوچے سمجھے آپ کو خط لکھ
ڈالا۔ آپ اس طرح ملنے بھی چلی آئیں گی میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا شرمندہ
ہوں اور بے حد!"
شانتا اپنی ہنسی نہ روک سکی۔

"یہ باتیں آپ خط میں بھی لکھ چکے ہیں۔ میں نے پڑھ لی ہیں۔ ویسے اس میں شرمندہ ہونے والی بات بھی کیا ہے۔ ہمارے سننے والے ہمیں خط بھی لکھتے ہیں۔ کبھی کبھار اپنی کہانیاں بھی سناتے ہیں۔ یہ سوچ کر کہ میٹھی آواز کا دل بھی میٹھا ہوگا۔"

اُس نے کھل کر بات کی۔

"آپ اپنے مداحوں کے خطوط کا جواب بھی دیتی ہوں گی؟"

"خود اندازہ کر لیجیے۔ جو نہرو پارک میں بلا جھجک آپ سے ملنے چلی آتی وہ خطوط کا جواب دیتی ہوگی یا نہیں! نیک ارادوں کی بات ہے!"

وہ جھینپ گیا۔

شانتا نے اپنی بات جاری رکھی۔

"آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔ خط میں نہ آپ کا نام تھا اور نہ ایڈریس۔"

اُس نے دبی زبان میں جواب دیا۔

"نام میں کیا رکھا ہے؟"

شانتا زیرِ لب مسکرائی۔

"یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن بغیر نام کے کام بھی تو نہیں چلتا۔ اگر گیت کے ساتھ میرا نام نشر نہ ہوتا تو آپ کا خط اور اُس میں لکھی ہوئی آپ کی داستان مجھ تک کیسے پہنچتی۔ اور پھر اِس ملاقات کی نوبت کیسے آتی؟"

اُس نے کھسیانے ہو کر جواب دیا۔

"مجھے راجندر کہتے ہیں!"

"کچھ کام بھی کرتے ہیں یا صرف اپنی آواز ہی کو ڈھونڈتے رہتے ہیں؟"

"ڈاکٹری کی ایک چھوٹی سی دُکان ہے!"

"دوائیں بیچنے والے ڈاکٹر ہیں یا علاج کرنے والے؟"

"ڈاکٹر ہوں!"

"تعجب ہے۔ ڈاکٹر ہو کر بھی شاعرانہ مزاج رکھتے ہیں۔ آپ کی صورت تو کسی غم کے مارے شاعر کی عکاسی کرتی ہے!"

"مجھ جیسا شکست خوردہ انسان اور دکھائی ہی کیا دے گا۔ آپ کو تو صرف شاعر دکھائی دیا۔ لوگ مجھے سودائی سمجھتے ہیں۔"

"لوگ ٹھیک ہی سمجھتے ہیں۔ جینے میں سلیقہ نہ ہو تو دیکھنے والے ایسا ہی سمجھتے ہیں۔"

"آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ زیادہ اپنا ہی قصور ہے۔ لیکن کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"یہ معمولی سی بات ہے۔ یہ لاابالی پن چھوڑ دیجئے۔ ذرا صحیح معنوں میں انسان بن کر اپنے آپ کو دیکھئے۔ اپنے اندر جھانکئے۔ ہو سکتا ہے ماضی کہیں بھی نہ رہے۔ اور حال خوب صورت ہو جائے۔"

راجندر نے شانتا کی گہری نیلی جھیل کی سی آنکھوں میں جھانکا۔

مسکراہٹوں کی کلیاں مہک رہی تھیں۔ اُمیدوں کے مدوجزر جنم لے رہے تھے۔ کہانیوں کی کہکشاں پھوٹ رہی تھی ——راجندر نے اپنی آنکھیں موند لیں —— ایک مچلتا ہوا گیت تھا۔ ایک مچلتا ہوا سنگیت تھا۔ ایک مچلتی ہوئی آواز تھی۔ تینوں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔ ایک پُرسکون سنگم بنا۔ شانتا کے معصوم، دلفریب نقوش سمیٹے ہوئے۔

شام دُھندلا گئی۔
ڈوب گئی ——!
رات گہری ہو گئی۔
تاریکیوں میں کھو گئی ——!!

ایک مختصر سی ملاقات کے چند مختصر سے لمحوں نے ایک طویل زندگی بخش صبح کو جنم دیا۔ دو گیت اپنا اپنا سنگیت پانے کے لئے جستجو کرنے لگے۔ دونوں ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگے۔
ایک کی آواز دوسرے کی دھڑکن بن گئی۔

———

.... ایک دن شانتا اور ڈاکٹر راجندر پارک میں ٹہل رہے تھے۔ چہل قدمی کرتے خوش گپیوں میں مصروف اُس گوشے میں پہنچے۔ جہاں ایک شام کو دونوں کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھا۔ شانتا نے شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔

راجندر نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر زور کا قہقہہ لگایا۔ شانتا ٹھٹک گئی۔

"آج پہلی بار تم اتنے کھُل کر ہنستے ہو۔ کیا بات ہے؟"

"ہاں پہلی ملاقات کی شاعرانہ باتیں یاد آگئیں۔ جو ایک کوی نے اپنی کویتا کے ساتھ کی تھیں۔"

"کیا مطلب؟"

"آج تمہیں ایک عجیب سی بات بتاتا ہوں!"

"تم روز ہی کوئی نہ کوئی عجیب بات سُناتے ہو۔ اور میں سُنتی ہوں۔ اس میں نئی بات کیا ہے؟"

"ابھی ہی ایک عجیب و غریب اور اپنے ڈھنگ کی انوکھی بات ہے، جو اس تنہا گوشے دیکھ کر یاد آگئی۔ بُرا نہ مان جاؤ تو بتا ہی دوں۔"

شانتا نے اپنی گردن کو ہلکی سی جُنبش دی۔

"بتا دو!"

راجندر نے اُس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

"ایک بار میں نے اپنے خط میں اُرملا کا ذکر کیا تھا۔"

"لیکن یہ بھی تو کہا تھا کہ پھر اُرملا کا نام نہیں لوں گا۔"

"ہاں، لیکن یہ تو میں نے بتایا ہی نہیں کہ ایسی لڑکی کا کوئی وجود ہی نہیں۔ درحقیقت اس دُنیا میں کبھی میری اُرملا پیدا ہی نہیں ہوئی۔"

شانتا نے گمبھیر آواز میں پوچھا۔

"کیا مطلب ؟"

"مطلب یہ کہ میں نے بچپن سے لے کر اس عمر تک تمہارے سوا کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔"

شانتا نے بمشکل آواز نکالی۔

"لیکن وہ ارملا اور وہ فساد۔ اور وہ میری آواز اور وہ ——
تم آج کیسی باتیں کر رہے ہو؟"

راجندر نے کسی فلمی ہیرو کا انداز بنا لیا۔

"بات معمولی سی ہے۔ بس اتنی سی کہ ریڈیو اسٹیشن جاتے ہوئے روز تمہیں دیکھا کرتا تھا، تمہاری آواز بھی سنا کرتا تھا۔ اُن دنوں اپنا دھندہ صرف دھندہ ہی تھا فرصت زیادہ تھی اور کام کم۔ بیکار بیٹھا تمہارے بارے میں سوچا کرتا۔ کئی بار پرارتھنا کی کہ شانتا بیمار پڑ جائے اور میرے علاج سے ٹھیک ہو جائے۔ جب میری پرارتھنا قبول نہ ہوئی تو میں نے تقدیر کا سہارا چھوڑ کر تدبیر کی شرن لی۔ تمہاری تند مزاجی کا تو محلے میں چرچا تھا ہی۔ میں نے کہانی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ کسی افسانہ نگار کی کہانی سے فقرے چرائے۔ اور ارملا اور سنگیت اور آواز کا ایک پلاٹ بنا لیا۔ اور تم خود بخود میرے قریب آگئیں۔ اور آج ...."

شانتا نے غیر شعوری طور پر راجندر کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اُس کا سارا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ یکبارگی اُس کے خاموش خیالوں کو دل کی دھڑکنوں نے گدگدایا۔ مسکرائی

ہوئی آنکھوں سے راجندر کا ہاتھ اپنے دل سے لگا لیا۔ اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اب کی بار راجندر ٹھٹھک گیا۔

"آج پہلی بار تم اتنی کھُل کر ہنسی ہو۔ حالانکہ ...... کیا بات ہے؟"

شانتا نے ہنستے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

"آج میں بھی تمہیں ایک عجیب و غریب اور اپنے ڈھنگ کی انوکھی بات سُنانا چاہتی ہوں"۔

"کیا بات؟"

"میں جان گئی تھی کہ سب ڈھونگ ہے لیکن ....."

"لیکن کیا؟"

"مدّت سے میری بھی یہی آرزو تھی کہ میں ڈاکٹر راجندر کے قریب آؤں۔ کیونکہ محلّے میں تمہاری شرافت کے بہت چرچے تھے"۔

راجندر نے شانتا کی آنکھوں میں جھانکا۔

"تو کیا ہم نے ایک دوسرے کو دھوکا دیا؟"

وفورِ مسرّت سے شانتا کی آنکھیں پُر نم ہو گئیں۔ اُسے کسی بھُولے بسرے گیت کے بول یاد آ گئے۔ اُس نے اپنی سُریلی آواز میں جیسے اُنہیں گنگنایا۔

"نہیں۔ صرف اپنی چاہت کی تکمیل کی۔ صرف ایک پُر اثر آرزو،

ایک پوتر تمنا کو پورا کیا؟"

راجندر کی آنکھوں میں شرارت مچلنے لگی۔

"اور یہ بچارا تنہا گوشہ؟"

شانتا نے اسی رو میں جواب دیا۔

"یہ تنہا گوشہ ہمارے ملاپ کا مندر ہے۔ آؤ یہاں پھول چڑھائیں

اور پھر آج ہماری شادی کی پہلی سالگرہ بھی تو ہے!"

راجندر نے شانتا کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے چوم لیا۔ نہر وہار کی

شام نہ جانے کب سے منتظر تھی۔ اس مختصر لمحے کے لئے!!!

بِن برسے بادل

منڈلاتے بادل

پروفیسر ناتھ ایک عجیب سی اُلجھن میں پھنس گیا۔ اُس کے دل میں رہ رہ کر ایک ہی خیال آتا، کہ جب شادی ہی نہیں کرنی ہے تو پھر لڑکی دیکھنے۔ پسند یا ناپسند کرنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ لیکن رائے صاحب بضد تھے۔ وہی اُس کی یتیم زندگی کا سہارا تھے اُن کی بات کیسے ٹالتا۔ آیا تھا وہ اپنے کسی دوست کی شادی میں۔ خدا خدا کر کے وہ ہنگامہ ختم ہوا تھا۔ اور رائے صاحب کے ہاں وہ سکون کا سانس لینے آیا تھا۔ لیکن ایک دوسرا ہنگامہ کھڑا کر دیا گیا۔ اپنی گزشتہ زندگی کے جو سسکتے لمحے وہ اپنی شکست خوردہ یادوں کے ساتھ دفنا چکا تھا۔ پھر اُس کے سامنے تڑپنے سسکنے کے لئے آ گئے۔

رات کافی بھیگ چکی تھی۔ لیکن نیند کہیں نہیں تھی۔ سکوں کہیں نہ تھا۔ پروفیسر ناتھ کی اپنی پینتیس سال کی زندگی میں صرف ایک رات ایسی

آئی تھی، جب اُس کی جوانی شگفتہ تھی۔ ذہن کورا تھا اور زندگی بے فکر تھی۔ نگاہوں کے سامنے اپنی محبت ،، ایک اُجیالا نقش تھا۔ دل کی دھڑکنوں میں یادوں کی گنگناہٹ تھی۔ اور تصور میں زندگی کی منور وسعتیں تھیں۔ تب اُس نے سوچا تھا، اپنی زندگی کے بارے میں، ازدواجی زندگی، اپنی شادی کے بارے میں۔ اپنے گھر بار کے بارے میں۔ اپنی ایک چھوٹی سی دُنیا کے بارے میں! اپنی بوڑھی ماں کی آخری حسرت، آخری تمنا کے بارے میں۔ لیکن اُس کی سوچیں ایک محدود ہی دائرے میں گھوم سکتی تھیں وہ ایک چھوٹی سی غریب سی دُنیا کا باسی تھا سر پر باپ کا سایہ بھی نہ تھا تعلیم کے ساتھ دو وقت کی روٹی کے لئے بھاگ دوڑ کا چکر بھی تھا۔ ماں کی بیماری کا غم بھی تھا۔ اُس کی ماں کچھ دنوں کی مہمان تھی۔ اور اُس کی مہمان ماں کی آخری تمنا، آخری حسرت تھی کہ وہ اپنی بہو کو دیکھے۔ اُس کا ماتھا چومے اور ہمیشہ کے لئے سُکھ اور سکون کی نیند سو جائے۔ تب ناتھ رات بھر سوچتا رہا تھا۔ اور اُسی سوچ میں ڈوبے ہوئے صبح سویرے ہی اوشا سے ملنے چلا گیا تھا۔ وہ دونوں ہم جماعت تھے، دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ لیکن اوشا ایک بہت بڑے گھر کی لڑکی تھی۔ اور ناتھ ایک درمیانہ گھرانے کا فرد۔ لیکن اُن کی محبت میں وہ فرق حائل نہ تھا۔ اُس نے ایسا ہی سمجھ رکھا تھا۔ کیونکہ اگر محبت ہے تو وہ بلندیاں نہیں دیکھتی پستیاں نہیں دیکھتی۔ وہ ایک خاص سطح کی پیداوار ہوتی ہے۔ وہ سطح اپنی جگہ پر اٹل رہتی ہے۔ بلندیاں اُس کی جانب جھکتی ہیں اور پستیاں اُبھر کر

اُسے اپناتی ہیں۔ ماں کی آشا پوری کرنے کا ایک ہی ذریعہ تھا کہ وہ اوشا سے ملے۔ اور جو بات کل ہونی ہے وہ کیوں نہ آج ہو جائے؟ وہ ایسے ہی خیالوں کو اپنائے اوشا کے گھر پہنچا۔ اوشا بڑے تپاک سے ملی۔

ناتھ نے اپنے مضطرب دل کو سنبھال کر اپنے ارادے کو ظاہر کیا۔

"اوشا! تم جانتی ہو کہ ماں اب کچھ ہی دنوں کی مہمان ہے۔ اُس کی کوئی آرزو پوری نہیں ہوئی۔ اُس بچاری کی کوئی آرزو تھی ہی نہیں۔ رات میں نے اُسے بہت دُکھی دیکھا۔ رات بھر روتی رہی۔ وہ چاہتی ہے...."

ناتھ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔

اوشا نے جیسے سب کچھ سمجھ لیا۔

پھر بھی اُس نے دبی زبان سے پوچھا۔

"کیا چاہتی ہیں وہ؟"

"یہی کہ اپنی بہو کا مُنہ دیکھ لے۔ اور تم جانتی ہو۔ میں نے کبھی ایسا سوچا بھی نہیں۔ ادھوری تعلیم کی ادھوری زندگی ہے۔ کچی کوری سی۔ لیکن ماں کا دُکھ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ...."

اوشا نے بات کاٹ دی۔

"تو ماں کی شانتی کے لئے شادی کر لو۔"

ناتھ کے چہرے پر اپنی ماں کی زندگی کی رمق اُبھری۔

"مجھے یقین تھا، تم میرے خیال کا ساتھ دو گی۔"

اوشا نے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"تم نے کوئی لڑکی دیکھ رکھی ہے کیا۔ جو فوری شادی کے لیے تیار ہو۔ جو تمہاری اِس ادھوری زندگی کو اپنانے کے لئے تیار ہو۔ جو....."

اوشا نے ایک ہی سانس میں بہت سی باتیں کہہ دیں۔ ایک ہی سانس میں بہت سی غلط فہمیاں دُور کر دیں۔ اب اُس کے سامنے اوشا نہیں تھی۔ ایک بہت بڑی کوٹھی کی چہار دیواری تھی۔ اُس چہار دیواری بھری پُری زندگی تھی۔ زندگی کا لہلہاتا ہوا شاداب لان تھا۔ وہاں سب کچھ تھا لیکن اوشا نہیں تھی۔ اوشا کی محبت نہ تھی۔ وہاں سب کچھ تھا۔ لیکن اُس کی اپنی ذات نہ تھی۔ اپنی ماں کی زندگی نہ تھی۔ اور اوشا نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیا تھا۔ بہت کچھ کہہ دیا تھا۔ برسوں سے جلتے ہوئے خیالوں کے دیوں کو ایک ہی پھونک سے بجھا دیا تھا۔ اور کچھ کہے سُنے بغیر وہ وہاں سے لوٹ آیا تھا۔ اور اپنی ماں کی منتظر آنکھوں میں جھانکا تھا۔ جن میں اُمید سو چکی تھی۔ صرف ممتا کی ہمک باقی تھی۔ اور پھر وہ ہمک بھی مٹ گئی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے.......

لیکن وہ ممتا بھری ہمک مٹی نہیں۔ ناتھ کے ساتھ رہی۔ تعلیمی دَور ختم ہوا۔ ملازمت کا دَور شروع ہوا۔ جوانی کے بھرپُور لمحے مُنجمد ہوتے گئے۔ وہ ہمک ساتھ رہی، اُسے کامیاب بناتی رہی۔ اور آج وہ نفسیات کا پروفیسر تھا۔ اچھی تنخواہ تھی، اچھی رہائش تھی، اچھی عزت تھی۔ اب اُس نے کتابوں کو اپنا جیون ساتھی بنا لیا تھا۔ اپنی تنہائیوں کو اپنے سفر کا ساتھی بنا لیا تھا۔ اور اپنی زندگی کے اُس عجیب سے زاویئے کو اپنا کر ساری دُنیا کا سکون

اپنے آس پاس اکٹھا کر لیا تھا۔ شادی بیاہ کے نام ہی سے اُسے نفرت تھی۔
اگر اُس کی ماں عورت نہ ہوتی تو شاید وہ عورت ذات ہی سے نفرت کرتا
پروفیسر ناتھ کی آنکھوں میں نیند کی جگہ کچھ ایسے ہی بیتے لمحے جم کر
بیٹھ گئے تھے۔ اُس نے آنکھیں موند لیں۔ رائے صاحب کے الفاظ اُسے
صاف سُنائی دے رہے تھے۔ اچھی لڑکی ہے، اچھا گھرانہ ہے۔ سال بھر ولایت
میں رہ کر آئی ہے۔ دیکھ لو اُسے، ہو سکتا ہے تمہارا نفسیاتی اُلجھنوں کا مارا
ذہن سُلجھ جائے اور اپنی زندگی کا اہم فرض پورا کرنے کی سوچ لے......
یہ رائے صاحب کے الفاظ تھے۔ اُن کا دل رکھنے کے لیئے اُس نے ملاقات کرنے
کے لئے ہاں کر دی۔ لیکن اُس ہاں نے اُس کی زندگی کا وہ دریچہ کھول دیا۔
جہاں سے ماضی کی پرچھائیاں اُسے صاف دکھائی دیتی تھیں۔ یادوں کے مدفن
صاف دکھائی دیتے تھے۔ جن پر نظریں جمائے اُسے ایک اجنبی سے اضطراب
کا احساس ہوتا رہا۔ رات اُس نے اُسی اضطراب میں تڑپتے گزاری جب
وہ سویا، صبح ہو چکی تھی۔

کالج جاتے وقت رائے صاحب کی چھوٹی لڑکی بملی نے دیکھا، کمرے کے
کواڑ بند تھے۔ وہ کہیں شادی کے ڈر سے بھاگ ہی نہ گیا ہو۔ اسی خیال سے بملی
کواڑ کھول کر کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ سو رہا تھا۔ اور اُس وقت نو بھی بج
چکے تھے۔ اُس نے پروفیسر کے منہ پر سے لحاف اُٹھاتے ہوئے کہا۔
"پروفیسر بھیا عجیب آدمی ہو! وہ لوگ ٹھیک گیارہ بجے آ رہے ہیں۔
اور تم ہو کہ ابھی تک سوئے پڑے ہو۔ نو بھی بج گئے! جلدی جلدی اُٹھو۔

کپڑے بدلو۔ اور یہ پروفیسری کی نقاب اُتار کر طالب علم بن جاؤ۔ فلسفہ نہ جھاڑنا۔ سیدھی سادی دُنیاداری کی باتیں کرنا! میں کالج چلی۔"

پروفیسر نے جمائی لیتے ہوئے پوچھا۔

"تم نہیں بیٹھو گی میرے ساتھ؟"

"نہیں، تمہیں لڑکی کو جاننے کا پورا پورا موقع دیا جائے گا۔ میں کالج جا رہی ہوں۔ پتا جی دفتر جا رہے ہیں۔ ماتا جی لڑکی کے ماں باپ کو سنبھال لیں گی۔ اور تم لڑکی کا نفسیاتی طور پر تجزیہ کرنا۔ میں چلی۔"

بمل چلی گئی۔

اور پروفیسر ناتھ نے نہا دھو کر لباس بدلا اور چائے پی کر اخبار کے مطالعے میں کھو گیا۔ دورانِ مطالعہ میں اُس نے گھڑی کو صرف ایک بار دیکھا۔ پورے گیارہ بجے تھے۔ اُس کے سارے جسم میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اپنے اندر کے ایک عجیب اجنبی سے احساس کو دبانے کے لئے اُس نے سگریٹ سلگائی۔

"نمستے!"

دروازے پر ایک لڑکی کھڑی تھی۔

فاختائی رنگ کی ساڑی میں ایک فاختائی رنگ کا چہرہ مسکرا رہا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔ ماتھے پر ایک زلف لہرا رہی تھی۔ پروفیسر ناتھ کی بینائی دھندلا گئی۔ دھندلا کر دو بار چمکی۔ پینتیس سال کی عمر پیچھے کی جانب بھاگی۔ پیچھے کی جانب بھاگ کر پچیس برس کی عمر میں داخل ہو گئی۔ لڑکی کی ایک ہی

جھلک نے اُس میں جوانی کا ایک نیا روپ جگا دیا۔ بہاروں کی ایک نئی خوشبو دوڑا دی۔ لڑکی سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ نئے چاند کی کرنیں اُس پر نچھاور کر رہی تھی۔ وہ جلدی جلدی کرسی پر سے اُٹھا۔

"آئیے، بیٹھئے، میں آپ کو پہچان نہ سکا!"

لڑکی اُس کے قریب بیٹھ گئی۔

پروفیسر نے اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لئے نیا سگریٹ سُلگایا۔

"میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ دراصل میں آپ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ دیکھئے نا۔۔۔۔"

لڑکی مسکرائی۔ اُس کی معصوم سی مسکراہٹ نے جیسے پروفیسر کے دل کی دھڑکنوں کو چھو لیا۔

"مجھے معلوم تھا آپ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں جانتی تھی آپ مجھے دیکھ کر خوش ہوں گے۔"

پروفیسر نے سنجیدہ لہجہ اپنا لیا۔

"میں نے آپ کے بارے میں جتنا بھی سوچا، جتنا بھی سوچ سکا، عجیب سا ہی سوچا۔ آپ کی تصویر جو میرے ذہن میں بنی تھی۔ جو میں نے درحقیقت بنا ڈالی تھی۔ آپ کی صورت ویسی نہیں ہے۔ درحقیقت میں لڑکیوں کے بارے میں، شادی بیاہ کے بارے میں اپنے الگ ہی خیالات رکھتا ہوں۔ اور وہ خیالات ایک خاص طرز میں ڈھل چکے ہیں۔ لیکن آج میں نے محسوس کیا۔ آپ کو دیکھ کر اِس نتیجے پر پہنچا کہ ایسا مجھے کبھی سوچنا

نہیں چاہئے۔ اگر مجھے اپنی تنہائیوں سے پیار ہے۔ تو آپ عورت کے روپ میں ایک سراپا تنہائی ہیں۔ اگر مجھے اپنے کتابی مطالعے سے محبت ہے، تو آپ ایک سراپا کتاب ہیں۔ اگر مجھے . . . . "

لڑکی نے مسکرا کر اپنی نظریں جھکا لیں۔

"چھوڑیئے اِن باتوں کو۔ اِن کے لئے سارا جیون پڑا ہے۔ آپ نے مجھے پسند کر لیا، میں نے آپ کو، ایک کٹھن بات آسان ہو گئی۔ کسی سے کہنا نہیں کہ میں آپ سے ملنے آئی تھی۔"

"کیا آپ کے گھر والے ساتھ نہیں؟"

"نہیں۔ میں اکیلی ہی آئی ہوں۔ اچھا مجھے اجازت دیجیے۔"

پروفیسر خاموش کھڑا رہا۔

لڑکی نے جاتے جاتے دبی زبان سے پوچھا۔

"آپ جلدی تو نہیں جا رہے ہیں؟"

پروفیسر نے اپنی کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"کل چلا جاؤں گا۔ اب مجھے اور کسی سے نہیں ملنا۔ کسی سے کچھ نہیں کہنا سُننا۔ اب میں آؤں گا صرف آپ کو لینے . . . "

لڑکی چلی گئی۔

پروفیسر کا سر چکرا گیا۔ پچیس سال کی عمر آگے کی جانب بھاگی۔ بھاگ کر پھر پینتیس برس کی عمر میں داخل ہو گئی۔ سارا جسم پسینے سے تر بتر ہو گیا۔ یہ کیسا لمحہ پھوٹا۔ یہ کیسی دھڑکن بجی۔ جسم میں کون سی نئی روح داخل ہو گئی۔ یہ

کیسی لڑکی تھی جسے دیکھتے ہی صدیوں پرانے خیال مِٹ گئے۔ یہ کیسی گنگناہٹ تھی جس نے پرانی راہوں کے نشان دھندلا دیئے۔ اور ایک نئی ڈگر پر اپنے سانسوں کی جوت جگا دی؟!..... اُس کی گھبرائی، سٹپٹائی ہوئی سوچوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ رائے صاحب کی بیوی کی آواز گونجی۔

"بیٹا! اُن لوگوں کا ٹیلیفون آیا ہے کہ وہ آج نہیں آرہے۔ لڑکی کے ماموں کو باہر سے آنا تھا۔ وہ نہیں آیا۔ اب پرسوں شام کو آئیں گے"

پروفیسر خاموش رہا۔ جیسے وہ پہلے ہی سے جانتا تھا۔

شام کو چائے کی میز پر بیٹھے سب ایک دوسرے کا مُنھ تک رہے تھے۔ پروفیسر کے فیصلے پر سب کو تعجب ہوا۔ اُس نے رائے صاحب سے کہہ دیا تھا کہ "میں لڑکی کو دیکھنا نہیں چاہتا۔ لڑکی کے ماں باپ اور رشتہ داروں سے ملنا نہیں چاہتا میں کل واپس جا رہا ہوں۔ پرسوں وہ لوگ آئیں گے تو بات پکی کر دیں۔ میں شادی کے لئے تیار ہوں۔"

رائے صاحب خاموش رہے۔ رائے صاحب کی بیوی خاموش رہی۔ لیکن بمل کے مُنھ سے چیخ نکل گئی۔ اُس نے سمجھ لیا کہ پروفیسر بھیا پہلے اپنی ذات سے مذاق کرتا رہا۔ اب دوسروں سے بھی مذاق کی ٹھان لی۔ بات سب کے لئے خوشی کی تھی، لیکن سب تعجب میں کھوئے ہوئے تھے۔

شام کو جب گھومنے گئے تو بمل نے بات چھیڑی۔

"بھیا! ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی۔ جو شخص لڑکیوں کے نام سے

نفرت کرتا ہو۔ جو اُن سے ملنا پسند نہ کرتا ہو۔ وہ بغیر دیکھے بھالے ہی شادی کے لئے راضی ہو جائے۔ پہیلی ہی ہے۔ کہیں پتا جی کے دباؤ سے ایسا فیصلہ تو نہیں کیا۔ بیاہ شادی کا معاملہ ہے۔ ایک لڑکی کی زندگی کا معاملہ ہے۔ میری مانو تو اِس ارادے کے ساتھ کہ شادی کرنی ہے۔ لڑکی سے ضرور مل لو۔"

پروفیسر نے اُس کی باتوں کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کے بعد جواب دیا۔

"ہو سکتا ہے لڑکی کو میں نے دیکھ لیا ہو۔"

بمل ہنسنے لگی۔

"صبح سویرے خوابوں میں دیکھا یا کتابوں میں؟"

"کچھ سمجھو۔ لیکن میں نے فیصلہ سوچ سمجھکر، دیکھ بھال کر کیا ہے!"

"اچھا پرسوں تک ٹھہر جاؤ!"

"اِس کی میں کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔ میں نے اپنا فیصلہ سُنا دیا۔ اور باتیں تمھیں لوگوں کو طے کرنی ہیں۔ میری کیا ضرورت ہے۔ جب مجھے بلواؤ گے سہرا باندھنے چلا آؤں گا۔"

"کالج کے نفسیاتی ماحول میں جاکر اپنا فیصلہ بدل دیا تو؟"

"جب فیصلہ کر ہی لیا ہے تو اسے اٹل سمجھو!"

دونوں دُور تک سیر کرتے نکل گئے۔ اس سے آگے کوئی بات نہ ہوئی۔ بمل نے لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ اُس کے بارے میں صرف سُنا تھا۔ اُس نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ پروفیسر لڑکی کی ولایتی تعلیم سے متاثر ہو گیا ہے۔ وہ آج تک

کسی ایسی ہی لڑکی کی تلاش میں تھا جو ہندوستانی ہو لیکن مغربیت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہو۔ پروفیسر نے یہ سب کچھ ایک ڈھونگ رچایا تھا۔ وہ سراپا ایک فراڈ ہے۔ واپسی پر بمل نے اپنے گھر والوں کو بھی اپنے تاثرات بتا دیے۔ وہ سب خاموش رہے۔

پروفیسر ناتھ نے اپنی زندگی کی ایک پُر سکون رات کاٹی۔ ایسی رات جس میں محبوبہ کا حسین خیال ہوتا ہے۔ خیال کی حیات پرور رعنائیاں ہوتی ہیں۔ رعنائیاں جن میں سہانے سپنوں کی دھڑکنیں ہوتی ہیں۔ ایک نئی زندگی کے کتنے نشان ہوتے ہیں سفر اور منزل کے گیت ہوتے ہیں۔ وہ گیتوں بھری رات پروفیسر کی زندگی میں نئی سی تھی۔ اُس نے محسوس کیا جیسے آج تک وہ ایک ایسا اندھیرا تھا، کھنڈروں کا اندھیرا جس پر چاند کبھی نہ چمکا تھا۔ چاندنی کبھی نہ تھرکی تھی۔ اور اب وہ خود چاند تھا۔ اور اُس کی روٹھی ہوئی محبوبہ چاندنی اُس کی بجھی بجھی سی دھڑکنوں کے ساتھ لپٹی بیٹھی تھی۔ اور وہ اپنی دھڑکنوں کو سمیٹے سو گیا۔

صبح وہ جلدی جلدی اُٹھا۔ اپنا سامان سنبھالا۔ لباس بدلا۔ اور کرسی میں دھنس کر اخبار پڑھنے لگا۔ دس بجے کی گاڑی سے لوٹ جانا چاہتا تھا۔ اور پھر۔ ۔ ۔ اور پھر ایک دن۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک دن۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"نمستے!"

مدھم سی آواز تھی۔ جیسے پازیب چھنک گئے ہوں۔

اُس نے اخبار سے نظریں اُٹھائیں۔

وہ لڑکی پھر اُس سے ملنے چلی آئی تھی۔ وہی فاختائی رنگ کی ساڑی میں ایک فاختائی رنگ کا چہرہ۔ بڑی بڑی سی آنکھیں، ماتھے پر لہراتی ہوئی زلف ایک نکھرا سنورا ہوا حُسن تھا۔ لیکن اب کی بار پروفیسر ناتھ کی بینائی نہ دھندلائی پینتیس سال کی عمر پیچھے کی جانب بھاگ کر پچیس سال کی عمر میں داخل نہ ہوئی۔ لڑکی مسکرا رہی تھی۔ مسکراتے ہوتے شرما رہی تھی۔ اُس پر تعلیم کا کوئی اثر نہ تھا۔ ولایتی رنگ کا کوئی انداز نہ تھا۔ وہ ایک الھڑ، معصوم، ہندوستانی لڑکی تھی۔ جیسے پہاڑوں کی دُھلی دُھلی، اُجلی اُجلی سی پریاں ہوتی ہیں۔ پروفیسر کے ہونٹ مسکرائے۔ پھر آنکھیں مسکرائیں۔ اُس کے بعد خیال مسکرائے۔ اور بہت ہی پیار بھری آواز میں کہا۔

"آئیے۔ بیٹھیے!"

لڑکی اُس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ ایک نظر پروفیسر کے سامان پر ڈالی۔

"میں نے سوچا، آپ جانے کی تیاری کر رہے ہوں گے۔ دیکھ آتی ہوں۔ چلی آئی۔"

پروفیسر کا چہرہ کِھل اُٹھا۔

"میرا فیصلہ سُن کر سب حیران رہ گئے۔"

"کیسا فیصلہ؟"

"یہی کہ میں شادی کرنے کے لئے تیار ہوں!"

لڑکی نے اپنے ہونٹ کاٹ لئے۔

"انہیں پتہ چل گیا، میں یہاں آئی تھی؟"

پروفیسر نے زور زور سے گردن ہلائی۔

"نہیں، میں نے کہہ دیا، میں لڑکی کو دیکھنا نہیں چاہتا۔ اُس سے ملنا نہیں چاہتا۔ جیسی بھی ہے مجھے پسند ہے!"

"آپ نے ایسا کہہ دیا؟"

"ہاں! اور کیا کہتا!"

لڑکی کا خاختائی چہرہ شفق کی طرح کھل گیا۔

"دیکھیے، در اصل میں کہنا چاہتی تھی..... دیکھیے....."

تبھی باہر سے آوازیں لگاتی آ رہی تھیں۔

"پروفیسر بھیا! پتاجی پوچھ رہے ہیں....."

دروازے پر پہنچ کر تبھی ٹھٹک گئی

اُس نے کواڑ کا سہارا لے کر کہا۔

"کنول! تم —— تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

لڑکی سمٹ گئی

پروفیسر نے تبھی کی بات کا جواب دیا۔

"مجھ سے ملنے آئی تھیں کل میں نے اپنے جانے کے بارے میں انہیں بتا دیا تھا۔ کل یہ مجھ سے ملنے آئی تھیں۔ میں نے اِن سے باتیں کر کے ہی شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔"

تبھی پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اُس کا سر چکرانے لگا تھا پروفیسر

نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تم کچھ اکھڑی سی دکھائی دیتی ہو؟"

بمل سنبھلی۔ وہ لڑکی سے مخاطب ہوئی۔

"کنول! جاؤ تمہارے پتاجی تمہیں بُلا رہے ہیں۔"

کنول نے ساڑھی سنبھال کر دونوں ہاتھوں سے پروفیسر کو نمستے کی۔ اور باہر چلی گئی۔

پروفیسر کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔

اُس نے بمل کے قریب بیٹھ کر پوچھا۔

"یہ بات کیا ہوئی؟"

بمل نے سر تھامے بات شروع کی

"تم نے اِس لڑکی کو پسند کیا ہے؟"

پروفیسر نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"لیکن بات کیا ہے؟"

بمل نے گھبرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"یہ وہ لڑکی نہیں ہے۔ یہ تو ہمارے محلے کی پگلی کنول ہے۔ میٹرک میں پڑھتی تھی۔ پاگل ہو گئی تھی۔ باپ ڈاکٹر ہے۔ سنبھالے ہوئے ہے۔ ورنہ کب کی مر گئی ہوتی۔ بھیّا! تم نے پسند بھی کیا تو کس پگلی کو۔ فیصلہ بھی کیا تو......"

بمل عجیب سے لہجے میں ایک عجیب سی بات سُنا رہی تھی۔

لیکن پروفیسر کے کان بہرے ہو چکے تھے۔ اُسے کچھ بھی سُنائی نہ دے رہا تھا۔ وہ اپنی بات سُناتی اندر چلی گئی اور وہ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ اخبار پر نظریں جمائے کسی نئی انوکھی سی خبر کا عنوان ڈھونڈتا رہا۔ لیکن وہاں کوئی نئی خبر نہ تھی۔ وہاں کوئی لفظ کوئی سطر نہ تھی۔ صرف کنول تھی جو مسکرا مسکرا کر اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُس نے کنول کی پاگل مسکراہٹ پر نظریں جمائے اپنے دل ہی دل میں سوچا۔

"میرا فیصلہ زندگی کے ایک خاموش لمحے کی پیداوار ہے۔ جو صرف ایک بار آنکھوں کے سامنے پھوٹتا ہے۔ اُس لمحے کی سوچیں، اُس لمحے کے فیصلے کبھی غلط نہیں ہوئے:۔ ہو سکتا ہے کنول پاگل ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کنول دوسروں کے لئے پاگل ہو۔ کیونکہ وہ اُنھیں پاگل نظر آتی ہے۔ لیکن میرے لئے پاگل نہ ہو۔ کیونکہ وہ مجھے پاگل نظر نہیں آتی۔ وہ مجھے پاگل نظر نہیں آتی۔ نہ پہلی ملاقات میں اور نہ دوسری ہی ملاقات میں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے کبھی پاگل نظر ہی نہ آئے۔ کنول سے شادی کا میرا فیصلہ زندگی کا اہم فیصلہ ہے۔ جو اٹل رہے گا۔۔۔۔"

اُس نے کار میں سامان رکھوایا

سب ہی خاموش نظروں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔

اُس سے ڈرسا محسوس کر رہے تھے۔

اُس نے کار میں بیٹھنے سے پہلے دبی زبان میں رائے صاحب سے کہا:۔

"آپ ڈاکٹر صاحب سے بات پکی کر یں۔ میں کنول ہی سے شادی کروں گا۔ وہ جس حالت میں بھی ہے، اُسے اپناؤں گا۔"

بمل نے عجیب سی نظروں سے پروفیسر ناتھ کو دیکھا۔

وہی پہلا پروفیسر بھیا تھا ـــــ نفسیات کا ماہر!

اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی پگلی کنول سے ملنے چلی گئی ـــ!!
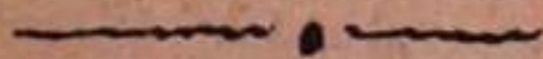
دُھندلے نقش

دُھندلے نقش

میرے سامنے شنکر آچاریہ کے دامن میں پھیلا ہوا وسیع مزار ہے۔ جہاں اَن گنت قبریں بکھری ہوئیں ہیں۔ ہزاروں کے سنگ مزار تک نہ جانے کب خاک میں مل چکے ہیں اور کتنوں کے لوح مزار بھی اب تک ساتھ چھوڑ چکے ہیں اور قبروں میں کچھ ایسی بھی قبریں ہیں جن میں اب بھی سینکڑوں تمنائیں، سینکڑوں خواہشیں سِسک سِسک کر دم توڑ رہی ہوں گی۔ نہ جانے کتنے کنوارے خیالات اب بھی پرواز کے لئے اپنی جدو جہد میں مصروف ہوں گے۔ کتنے محبت بھرے دل اپنے محبوب کے انتظار میں بے قرار ہوں گے ـــــ ٹھیک اُس چنار کے سائے میں جو نئی نئی قبر نظر آرہی ہے وہ افشاں کی ہے!

افشاں۔ جس میں مریم کا سا تقدس تھا۔ ہرن جیسی معصومیت تھی، سائیکی جیسا حُسن تھا۔ جس میں کلیوں کی سی پاکیزگی تھی۔ بہار

کی پہلی صبح کا اُجالا پن تھا۔ جو چاندنی کے نرم خنکی سے زیادہ دلفریب تھی۔

افشاں ـــــــ ؟ !! جو آرٹسٹ تھی۔ جس کے آرٹ میں زندگی تھی، زندگی کا حُسن تھا ـــــــ اور آج اِس قبر کو دیکھ کر مجھے بے ساختہ افشاں کی کہانی یاد آرہی ہے۔

●

افشاں کو میں بہت پہلے جانتا تھا۔ ہم نے تقریباً ساتھ ساتھ کالیج میں داخلہ لیا، ہماری بول چال بہت ہی کم تھی بلکہ نہ کے برابر مگر جب خالد نے بھی اِسی کالیج میں داخلہ لیا تو مجھے افشاں کو قریب سے دیکھنے اور اس سے باتیں کرنے کا موقع ملا۔ کیونکہ وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب تھے اور خالد میرا دوست تھا ہمارے بہت ہی قریبی تعلقات تھے۔ در اصل خالد نے صرف افشاں ہی کی وجہ سے ہمارے کالیج میں داخلہ لیا تھا۔ اِن دونوں کی محبت کا ہر راز مجھے معلوم تھا۔ یہ افشاں بھی جانتی تھی اور شاید اسی وجہ سے افشاں کو مجھ پر کافی اعتماد تھا، بھروسہ تھا!۔

اِن ہی دنوں مجھے ٹریننگ کے لئے منتخب کیا گیا اور مجھے اپنے گھر سے اپنے وطن سے، خالد اور افشاں سے بہت دور جانا پڑا۔ کچھ وقت تک مجھے خالد کے خط ملتے رہے۔ وہ مجھے بڑی تفصیل کے ساتھ افشاں سے اپنی ملاقات کی ہر بات لکھتا رہا۔ ایک سال، اسی طرح

گزر گیا اور اچانک مجھے خالد کے خط ملنے بند ہو گئے۔ میں کچھ پریشان سا ہوا۔ میں نے کوشش کی کہ مجھے خالد کے بارے میں کوئی اطلاع ملے مگر مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ افشاں کے بارے میں کوئی پتہ چل سکا۔ کئی سال بعد جب میں ٹریننگ ختم کر کے اپنے گھر واپس لوٹ آیا تو خالد کے بارے میں مجھے کوئی کچھ نہ بتا سکا۔ نہ معلوم وہ کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اس کا مکان ویران پڑا تھا۔ البتہ اس کے ہمسایوں سے پتہ چلا کہ خالد کا باپ مر گیا تھا اور اس کے بعد خالد بھی لاپتہ ہو گیا۔ میں شش و پنج میں پڑ گیا، مجھے افشاں یاد آئی۔ میں اُسے ملنے گیا تو معلوم ہوا کہ وہ سینی ٹوریم میں ہے ——— افشاں اور سینی ٹوریم ———؟! میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا اور میں افشاں سے ملنے ٹنگمرگ چلا گیا۔

●

"مگر افشاں، یہ سینی ٹوریم، یہ مریضانہ ماحول ——— یہ سب میں کیا دیکھ رہا ہوں ———؟! تمہارے چہرے پر یہ مردنی کیسی۔ تمہارا وہ حُسن کہاں گیا، وہ رنگ کہاں گیا ——— اُس روپ کا کیا ہوا ———" میں ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گیا ———!

"نور صاحب، آپ میرے چہرے پر جو مردنی دیکھ رہے ہیں، یہ موت کی علامت ہے اور اب مرنا چاہتی ہوں۔ یہ علامت میرے لئے نہیں بلکہ تپ دق کے ہر مریض کے چہرے پر نظر آئے گی۔ یہ سینی ٹوریم

کی فضا ہی کچھ ایسی ہے۔ بھلا آپ یہ سب کچھ سمجھ سکیں گے؟! آپ اپنے وطن سے دور رہے، کہاں باہر کا وہ رنگ، وہ روپ اور کہاں ہمارا یہ سینی ٹوریم ـــــ" اس کا لہجہ تلخ تھا۔

"اور وہ تصویریں بنانے کا شوق؟"

"ہاں وہ ضرور نکھر آیا ہے۔ موت کی بھیانک یاد جب بھی میرے دل کو ستاتی ہے تو بے ساختہ میرا ہاتھ کینواس پر چلنے لگتا ہے۔ نہ معلوم کیوں؟ مگر اب میں پورٹریٹ نہیں بناتی، صرف آڑی ترچھی لکیریں کھینچا کرتی ہوں۔ میں زندہ ہوں مگر موت کی بھیانک تصویر بن کر ــــ آرٹ میری زندگی ہے۔ مگر اس پر موت کی لکیریں کھنچی ہوتی ہیں ــــ"

میں لاجواب سا ہو گیا۔ اور مجھے بے ساختہ یاد آیا کہ دراصل میں خالد کے بارے میں معلوم کرنے آیا تھا۔

"اور خالد ــــــ" میں صرف اتنا کہہ سکا

"نور صاحب ـــ!" وہ چیخی!

"افشاں صاحبہ! میں نے صرف خالد کا نام لیا ہے اور آپ جانتی ہیں کہ ہم دونوں کے آپس میں کتنے گہرے تعلقات تھے۔ اور اس وقت آپ کو دیکھ کر سوچ رہا ہوں، کہیں ان تمام باتوں کا ذمہ دار خالد تو نہیں!"

وہ خاموش رہی!!

"دیکھئے میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا۔ مگر آپ سے اپنے دوست کے بارے میں ضرور کچھ سُننا چاہتا ہوں۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کے جی کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا!"

"ہوں ——" اس کے ہونٹ آہستہ سے ہلنے لگے!

"آج آپ کو اپنے دوست کی یاد آگئی۔ اُس وقت، آپ کہاں تھے جب - - - - - - - مگر اب پرانی باتیں دہرانے کو جی نہیں چاہتا۔ ان باتوں میں اب رکھا ہی کیا ہے۔ اور پھر باتیں ایک ہوں تو کہوں —— آپ نے میرے زخموں کو کُریدا ہے۔ آپ جانتے تھے، ہماری محبت کی کوئی بات آپ سے چُھپی نہ تھی۔ آپ ٹریننگ کے سلسلے میں باہر چلے گئے —— ہم حسبِ معمول کالج وقت کے بعد روز ملتے۔ باتیں کرتے، زندگی کی باتیں، مستقبل کی باتیں، ایک خوبصورت گھر کی باتیں، بچوں کی باتیں۔ اپنی باتیں، آپ کی باتیں ہماری محبت آزاد تھی، ہماری ملاقاتوں پر کوئی قید نہ تھی۔ اب تو ہماری حالت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اگر کسی روز ہم مل نہ پاتے تو زندگی پھیکی پھیکی سی لگتی۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ تقدیر ہمارے ساتھ نہیں۔ حالات ہمارے خلاف ہیں۔ ہمیں بچھڑنا ہوگا۔ ہماری محبت کے حسین محل کھنڈر بن جائیں گے۔ ہمارے خوبصورت سپنے بکھر جائیں گے۔

میں اُس دن کو کبھی نہ بھول سکوں گی۔ جب خالد مجھے آخری

بار ملا۔ اب تو اسی سہارے جی رہی ہوں ــــ ؟ یہ اُن دنوں کی بات ہے۔ جب کشمیر میں بہار تھی، زندگی تھی، رونق تھی۔ اس دن ہم ہارون گئے۔ سارا دن ہم نے ہارون میں گزارا ــــ شام ہوگئی اور باغ آہستہ آہستہ خالی ہوتا گیا۔ خالد کہہ رہا تھا۔

"افشاں تم میں مریم کا سا تقدس ہے۔ ہرن جیسی معصومیت ہے۔ تم سائیکی سے زیادہ حسین ہو۔ تم محبت کا چراغ ہو، پیار کا ساگر، میری اُمنگوں کا دریا۔ میں نے جب بھی اس دریا میں غوطہ لگانے کی کوشش کی ڈوب گیا۔ نہ معلوم میں تمہارے سامنے کیوں کھوسا جاتا ہوں ــ افشاں کھوسا جاتا ہوں ــ میں اپنے ارد گرد کے ماحول کو بھول کر صرف تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں ــــ تم میری زندگی ہو ــ زندگی؟!

وہ بولتا جا رہا تھا اور میں اس کی باتوں میں کھوئی جا رہی تھی۔

"دیکھو افشاں ہارون کے اس باغ میں آج رنگینی ناچ رہی ہے۔ شباب انگڑائیاں لے رہا ہے۔ جانتی ہو کیوں؟ صرف اس لئے کہ آج تم یہاں ہو ــ تم ــ افشاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔ گھر آنے پر معلوم ہوا کہ ہمارے وطن پر حملہ ہو چکا ہے۔ اور بہت علاقے پر حملہ آور قابض ہو چکے ہیں۔ خالد کا باپ بھی کاروبار کے سلسلے میں گاؤں گیا تھا اس کا نوکر بھاگتا ہوا آیا تھا اور خالد

کا انتظار کر رہا تھا ہمارے آتے ہی اُس نے خالد کو یہ خبر سنائی اس کا باپ مارا گیا ہے۔ خالد پر جنوں سوار ہو گیا۔ وہ اپنے باپ کی لاش کو دیکھنے اسی لمحہ چلا گیا۔ وہ باپ کا اکلوتا بیٹا تھا، اس کی ماں بچپن میں ہی مر گئی تھی، وہ اپنے باپ کو بے حد چاہتا تھا۔ ہم نے اُسے روکنے کی بڑی کوشش کی مگر وہ نہ مانا ——!

اور وہ چلا گیا —— ہمیشہ کے لئے چلا گیا! اس کے بعد خالد کا کوئی پتہ نہ چلا۔ میں نے خالد کی بڑی تلاش کی مگر میرا خالد مجھے کہیں نہ ملا، آج تک نہیں ——۔ بہاریں آئیں اور گئیں —— خالد نہ آیا—— اور اب میں ہوں اور یہ سینی ٹوریم !!!

افشاں رو رہی تھی۔ میری اپنی بھی کچھ ایسی ہی حالت تھی۔ چاہتے ہوئے بھی میں اُسے چُپ نہ کرا سکتا تھا —— بے ساختہ اس کی نظریں اپنے کمرے کی اس کونے کی طرف اُٹھی کی اُٹھی رہ گئیں جہاں خالد کی ادھوری تصویر تھی۔ اب میں اپنے آنسوؤں کو نہ روک سکا اور وہاں سے بھاگ آیا۔

اب ہر اتوار کو افشاں سے ملنے جانا میرا معمول بن گیا۔ میری اپنی عجیب حالت بن رہی تھی۔ میں افشاں کی موجودہ حالت کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے سوچا اور آخر ایک دن میں سویرے ہی افشاں کے پاس جا پہنچا!

"افشاں! میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں"

"کیا" — وہ چونک پڑی!

"میں شادی کرنا لینا چاہتا ہوں —" میں نے بات شروع کی۔

"جی ہاں کر لینی چاہیئے —"

"میں نے لڑکی کو پسند کر لیا ہے —" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"اور وہ لڑکی میرے سامنے ہے —"!

"نہیں — یہ نہیں ہو سکتا! یہ آپ کی دل کی آواز نہیں ضمیر کی آواز ہے —"

"دیکھئے —" میں نے وضاحت کرنے کی کوشش کی!

"نور صاحب — آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں — ایک بیوہ سے — خالد کی زندگی سے۔ مجھ سے، تپ دق کی ایک مریضہ سے — نہیں، نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ جائیے، خدا کے لئے چلے جائیے —"!

میں چلا آیا۔

میرا کسی کام میں دل نہ لگا۔ میں اداس تھا بے حد اداس —! کوشش۔ مجھے معلوم ہوتا کہ مجھے ہو کیا گیا تھا۔ میں صرف اتنا جانتا تھا۔ کہ یہ گندگی زہر ہے جو میرے شر بر کو ختم کر رہا ہے۔ یہ کوئی آگ ہے۔ جس میں

میں اندر ہی اندر جھلس رہا ہوں۔ یہ کوئی تپش ہے جو مجھے جلا رہی ہے
میرے سوچنے کی طاقت سلب ہو گئی تھی۔ میری آنکھوں کی روشنی
مرجھا رہی تھی۔ میرا دل نادیدہ غم کے سمندر کی عمیق گہرائیوں
میں ڈوبتا جا رہا ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا تھا جیسے یہ دل بند ہو جائے
گا ــــــ !! اسی دوران مجھے ایک دن سینی ٹوریم کے
ڈاکٹر کا فون آیا۔ افشاںؔ کی حالت بڑی خراب تھی اور وہ
مجھ سے ملنا چاہتی تھی ــــ میں اُسی وقت افشاںؔ سے ملنے
گیا۔ مگر ہائے میری بدقسمتی افشاںؔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی
اپنے خالد کے پاس پہنچ گئی تھی۔ اس کی لاش کو دیکھ کر مجھے
ایسا محسوس ہوا جیسے اُسے موت میں زندگی کی مسرت
حاصل ہو رہی ہو۔ جیسے وہ مسکرانے کی ناکام کوشش
کر رہی ہو ــــ !

میرے نام ایک خط تھا !

نورؔ صاحب !

شاید میں اب آپ کو نہ دیکھ سکوں گی ! آخر میرا
انتظار ختم ہو گیا۔ میں اپنے خالد کے پاس جا رہی ہوں۔
آپ سے ایک گذارش ہے۔ میری آخری تصویر کو سنبھال
کر رکھئے ــــ !

افشاںؔ

میری نظریں بے ساختہ کنواس کی طرف اُٹھی - وہاں خالد کی ایک ہنستی ہوئی خوبصورت تصویر تھی- اور اس کے نیچے کسی راہی کے قدموں کے دھندلے دھندلے نشان تھے- جو پستیوں کی جانب بڑھتے چلے جا رہے تھے- مجھے محسوس ہوا کہ میں خود تپ دق کا مریض ہوں اور پاؤں کے وہ دھندلے دھندلے نشان میری موت کے قدموں کے نشان تھے جو پستیوں کی تاریکیوں میں دُھنستے چلے جا رہے تھے -- !

میں افشاں کی لاش کو سرینگر لے آیا- اور شنکر آچاریہ کے دامن میں ایک نئی قبر کا اضافہ ہو گیا ـــــ ٹھیک چنار کے سائے میں جو نئی نئی قبر نظر آ رہی ہے، یہی افشاں کا گھر ہے ــــ

ایک طرف خالد کی قبر ہے-

دوسری طرف افشاں کی قبر ہے-

دونوں قبروں کے سامنے کھڑے ہو کر میں اکثر سوچتا ہوں- میرا ٹھکانہ کہاں ہے- میرا گھر کہاں ہے- میری قبر کہاں ہے! ؟-

میں خود بھی تو تپِ دق کا مریض ہی ہوں ؟!

ـــــ ۵ ـــــ

گُل خان

گُل خان

"پاگل ——!"

"بابو جی ——!!"

"چُپ کر بدمعاش کہیں کا؟!!!"

"بابو جی ——!" ایک بار پھر گُل خان کی جانی پہچانی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف دیکھا اُس کی بے نور آنکھوں میں ایک التجا تھی، اُس کا چہرہ کالا پڑ گیا تھا اور بڑھتی ہوئی ڈاڑھی نے اس کے چہرے کی وحشت میں کافی اضافہ کیا تھا، سر کے بے ترتیب بال چہرے پر جُھک آئے تھے ——!

سنیئے بابو جی —— میں بُرا سہی، پاگل سہی — مگر میں بدمعاش نہیں ہوں، میں بدمعاش نہیں ہوں۔ میری بات کا یقین کر لیجیئے۔

آپ نے جو سُنا ہے وہ غلط ہے، جھوٹ ہے۔ اِس محلّے میں صرف آپ ہی، جو مجھے پہچان گئے ہیں۔ اگر آپ بھی مجھے بدمعاش سمجھیں تو میں کہاں جاؤں، کس کے لئے جیوں؟! ـــــ اِس کے ساتھ ہی گل خان کی بے نور آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ وہ روتا رہا، چیختا رہا ـــــ "میں بدمعاش نہیں ہوں ـــــ میں بدمعاش نہیں ہوں ـــــ"

میں نے اُس کی ایک نہ سُنی اور وہاں سے چلا آیا!!

چھ سال کی دوستی میں آج پہلی بار میں اپنے دل میں گُل خان کے لئے نفرت محسوس کر رہا تھا۔ کل رات تک گُل خان میرا دوست تھا، مگر آج اور کل میں بہت فرق ہے۔ کل میرے دل میں اس کے لئے محبت تھی، دوستی کا احترام تھا، ہمدردی تھی، وہ محبت، وہ ہمدردی، جس کی جڑیں چھ سال سے مضبوط ہوتی آ رہی تھیں اور آج ـــــ آج ایک رات کے فاصلے نے ہمدردی اور محبت کی یہ سب جڑیں ہلا کر رکھ دیں تھیں۔ آج صبح جب میں دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ گل خان نے محلّے کی ایک لڑکی سے فحش مذاق کیا ہے۔ میرے دل نے بار بار مجھے سمجھا دیا گُل خان ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ اس کی زندگی کے ہر راز سے میں بخوبی واقف تھا۔ مگر جب اس بات کی تصدیق میرے چھوٹے بھائی نے بھی کی تو ماننے پر مجبور ہوا ـــــ!

گُل خان کو میں چھ سال سے جانتا ہوں۔ چھ سال کی بات ہے۔ میں کالج سے گھر آ رہا تھا کہ ایک غلیظ ترین آدمی کو میں نے ایک خالی دوکان کے کونے میں اپنی غلاظت کی دوکان سجائے دیکھا۔ میں نے پہلی بار اُس وقت اِس آدمی میں دلچسپی لینی شروع کر دی جب محلے کے شریر لڑکے اُسے پاگل کہہ کر چڑایا کرتے تھے۔ اور وہ پتھر اُٹھا اُٹھا کر اُن کے پیچھے دوڑتا۔ جب لڑکے پھر بھی اپنی شرارت سے باز نہ آتے، وہ ایک جوان بیوہ کی طرح بے ساختہ رونے لگتا —— ایک دن میں اس دوکان کے قریب ہی سگریٹ خرید رہا تھا کہ میں نے اُسے دیکھا۔ میرے قدم غیر شعوری طور اس کی جانب بڑھ گئے ——

"تم کیوں رو رہے ہو ——؟!" میں نے پوچھا، حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔ اس نے اپنی موٹی دہشت زدہ آنکھیں میری آنکھوں سے ملالیں۔ مجھے جھرجھری سی محسوس ہونے لگی۔ اس کا چہرہ سوجھا ہوا تھا۔ اس کی حالت خزاں کے اُس زرد پتے کی سی تھی جو ہمیشہ ہوا کے ایک جھونکے کا منتظر رہتا ہے۔ اِدھر جھونکا آیا، اُدھر اُس کی زندگی ختم ہو گئی۔

"جاؤ —— جاؤ یہاں سے ——" وہ چیخ پڑا!۔

میں اس کے قریب کھڑا رہا۔

"جاؤ ——!" اب کی بار اس کی آواز دھیمی تھی۔ نہ معلوم میرا دل کیوں اس کے لئے بھر آیا

"گل خان ——!" میرے یہ الفاظ اس کے لئے نئے تھے اب تک سب اُسے پاگل کہہ کر پکارتے تھے، اپنا نام سُنکر اس کی بے نور آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ وہ مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگا اور بے ساختہ اٹھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔

اُس کے جسم سے گندے پسینے کی بدبو آ رہی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں دُنیا کا سب سے گندہ آدمی ہوں۔ میں برداشت کرتا رہا۔ اُس دن مجھے معلوم ہوا کہ وہ دو دن سے بھوکا ہے۔ میں نے اُسے کھانا کھلایا۔

اس طرح ہماری دوستی کا جنم ہوا!!

میں اب تقریباً ہر روز گھر سے اس کے لئے کھانا لے آتا۔ اس کے قریب بیٹھ کر اس کی عجیب و غریب باتیں سُنتا۔ صبح کالج جانے سے پہلے سگریٹ کی ایک ڈبیا خرید کر دیتا۔ میں نے کئیں بار اس کے دل میں جھانکنے کی کوشش کی مگر وہ ہر بار ٹالتا رہا۔

زندگی گزرتی رہی!!

ایک رات میں بہت دیر سے گھر لوٹا۔ میں حسب معمول گل خان کو دیکھنے گیا مگر وہاں مجھے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ میں تقریباً ایک گھنٹہ اس کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آیا۔ دوسرے دن صبح جب میں اُسے دیکھنے گیا اور رات کے بارے میں تذکرہ چھیڑا تو وہ یہی کہتا رہا کہ اس نے ایک لمحے کے لئے بھی اپنی جگہ نہیں چھوڑی

میں حیران ہو گیا آخر رات کو یہ کہاں گیا تھا، کہیں میں نے خواب تو نہیں دیکھا تھا۔ دوسری رات میں جان بوجھ کر اُسے دیکھنے کے لئے گھر سے نکلا، وہ پھر غائب تھا! میں نے پھر ذکر کیا، اس بار بھی اس نے انکار کیا۔

آخر ایک رات میں نے گُل خان کا تعاقب کیا۔ ٹھیک رات کے بارہ بجے وہ اپنی جگہ سے ہلا۔ اپنا بستر ایک کونے میں رکھا اور چلنے لگا۔ میں اس کا برابر تعاقب کرتا رہا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ قبرستان میں داخل ہو گیا۔ اور ایک قبر کے سامنے بیٹھ گیا۔ رات کی بھیانک تاریکی میں قبرستان بڑا پُر اسرار نظر آرہا تھا۔ خوف سے میرے قدم منجمد ہو کر رہ گئے ——!!

گُل خان رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا —— "سلمیٰ، اب مجھ سے انتظار نہیں ہوتا۔ اب مجھے اپنے پاس بلا لو۔ میں بُزدل بھی نہیں ہوں کہ خودکشی کر لوں۔ مجھ میں اب اتنی ہمت بھی نہیں کہ اس بیمار زندگی کا مقابلہ کر لوں۔ اس بیمار زندگی سے مجھے کیا ملا، ایک بیمار ذہن، بیمار جسم —— میں جس ماحول میں رہتا ہوں وہ بھی بیمار ہے۔ میں جس ماحول میں پروان چڑھا وہ بھی بیمار تھا، مردہ تھا، بے حس تھا۔ مگر تم چُپ کیوں ہو سلمیٰ، تم بولتی کیوں نہیں۔ اس طویل خاموشی کو اب توڑ دو۔ میرے لئے سلمیٰ، صرف میرے لئے۔ تم بزدل نہ بنو، بیمار نہ بنو —— ! ایک بار صرف ایک بار کہو جاؤ گُل میں نے تمہیں

معاف کیا!۔

میں جانتا ہوں تم مجھ سے نفرت کرتی تھی۔ اس لئے مجھ سے بولنا نہیں چاہتی۔ تم تو اب آزاد ہو، پھر میں اس بے جان مٹی سے دور کیا لینے آتا ہوں!"

میں گل خان کے سامنے چلا آیا۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھتا رہا اور روتا رہا!۔

"گل خان — کیا بات ہے، یہ سلمٰی تمھاری کون ہے؟!۔

"بابو جی —"

"مجھے بتاؤ خان، کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں —!!"

"کیا بتاؤں — میری زندگی میں اب رکھا ہی کیا ہے جو آپ کو بتاؤں —"

"گل خان!"

"بابو جی — وہ زندگی کی جلتی ہوئی مشعل تھی۔ آگ کا شعلہ تھی — وہ — وہ میری بیوی تھی — بیوی!!!

"بیوی — سلمٰی تمہاری بیوی تھی —"

"ہاں بیوی — میری بیوی —!! بابو جی! سلمٰی ایک غریب لڑکی تھی۔ میں نے اُسے اپنانا چاہا مگر وہ مجھ سے نفرت کرتی تھی، میں نے اس کی غربت کا فائدہ اُٹھا کر اس کے ماں باپ کو سونے کی چمک سے اندھا کر دیا۔ میں نے سلمٰی کو خرید لیا۔ وہ میرے گھر میں دلہن بن کر

آئی۔ مگر بہت جلد مجھے محسوس ہونے لگا کہ اس کی موٹی موٹی آنکھیں سیاہ حلقوں میں گم ہو کر رہ گئیں ہیں۔ اس کی تمام خوبصورتی ختم ہو رہی ہے۔ یہ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ اور کسی کو چاہتی ہے۔ جو اُس کی طرح غریب تھا۔ وہ مجھ سے محبت نہیں، نفرت کرتی ہے ——!"

اتنا کہہ کر گُل خان خاموش ہو گیا ——!!

"پھر —— پھر کیا ہوا ——" میں نے کریدا۔

"پھر میرے اندر کا شیطان جاگ اُٹھا۔ میں نے ایک طوفانی رات کو سلمیٰ کو زہر دے کر ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ——!"

"گُل خان ——!" میں زور سے چیخ اُٹھا۔

"ہاں بابو جی —— میں نے سلمیٰ کو ختم کر دیا، ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ میں نے گناہ کیا، میں گنہگار ہوں —— وہ مر گئی، اس کی لاش سپردِ خاک ہوئی، میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ محبت ہمیشہ کے لئے فنا ہو گئی مگر مگر یہ میری بھول تھی، میں نے اپنا گھر چھوڑا۔ اپنا وطن چھوڑا، سکون کی تلاش میں گھومتا رہا مگر مجھے میرا سکون کہیں نہ ملا —— اور اب میری یہ حالت ہے!"

وہ پھر رونے لگا، میں نے آہستہ سے اس کے آنسو صاف کئے اور ہم قبرستان کی پُر وحشت فضا سے نکل آئے۔ میں نے اس واقعہ کا ذکر کسی سے نہ کیا۔ اور آج چھ سال کے اس طویل عرصے میں پہلی بار گُل خان نے کسی لڑکی سے فحش مذاق کیا تھا!۔

گل خان کی زندگی کا ایک ایک واقعہ میرے ذہن میں گھومنے لگا۔ دفتر میں میرا دل بالکل نہ لگا، میں سوچ رہا تھا کہ دوسروں کی باتوں میں آکر میں نے گل خان کی بے عزتی کی ہے۔ اپنی چھ سالہ دوستی پر لات ماری ہے۔ گل خان کسی لڑکی کو چھیڑ سکتا ہے، یہ ناممکن بات ہے! میں فوراً دفتر سے واپس چلا آیا۔ راستے میں جوزف ملا۔ جیسے اُسے میری ہی تلاش تھی۔

"یار تم نے گل خان کے بارے میں کچھ سنا ـــــ!؟"

"کیوں۔ کیا ہوا ـــــ؟!" میں انجان بنا رہا۔

"محلے والوں نے اُسے خوب پیٹا۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ رات کو غائب ہو جاتا ہے اور شاید چوری کرتا ہے ـــــ!"

"مگر اپنے یہاں تو چوری کی کوئی واردات نہیں ہوئی۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ شاید اسی لئے اب انہوں نے وہ لڑکی والا بہانہ تراش لیا۔"

جوزف کہتا جا رہا تھا اور میرا جسم غصّے سے کانپ رہا تھا۔ یہ لوگ اتنے کمینے ہو سکتے ہیں۔ اس کا مجھے خیال تک نہ آیا تھا!

میں دوڑتا ہوا گل خان کو دیکھنے گیا۔ اس کے سامنے بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ میں تیزی سے آگے بڑھا۔ جب میری نظریں گل خان پر پڑیں میں چونک پڑا، میری آنکھیں پتھرا گئیں۔

میرے سامنے گل خان زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا!۔

"یہ کیا ہوا ــــــ؟!" میں نے کسی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں ــ میں بھی ابھی آیا۔ سنا ہے کہ اس پر دورہ پڑا تھا۔ اور یہ چیخ رہا تھا ــ میں بدمعاش نہیں ہوں ــــــ!!"

"گُل خان ــــ" میں نے پکارا۔ اس کی آنکھوں میں حرکت ہوئی۔

"بابو جی ــــــ!"

"گُل خان، ــــ مجھے معاف کرو، میں نے تمہیں غلط سمجھا۔"

"بابو جی ــــ میں بدمعاش نہیں ہوں۔ میں بدمعاش نہیں ہوں!"

میری آنکھوں سے بے ساختہ آنسو نکل پڑے۔ گُل خان مر رہا تھا۔ زندگی مر رہی تھی۔ محلّے والوں کی شرافت مر رہی تھی، انسانیت مر رہی تھی۔"

"بابو جی ــــ مجھے اپنا ہاتھ دیجئے۔ مرنے سے پہلے صرف ایک بار کہہ دیجئے، کہ میں بدمعاش نہیں ہوں!"

میں نے گُل خان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا وہ برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، گُل خان کا ہاتھ اکڑ کر رہ گیا۔

اور جب گُل خان اپنی سلمیٰ سے جا ملا تو مجھے محسوس ہوا جیسے آج گُل خان نہیں میرے اندر کا انسان مر گیا!!!

ــــــ ٥ ــــــ

بے گھاٹ کی ناؤ

(مجّی اور ریشماں سے معذرت کے ساتھ)

"بے گھاٹ کی ناؤ"

..... جھیل جیسی نیلی آنکھوں والی لڑکی۔
شفق جیسے سرخ بالوں والی لڑکی
رو لو —— خوب رو لو!
اپنے دل کے داغ دھو لو
دُنیا تیرا دُکھ کیا سمجھے گی؟!!
تُو نے بھی چاہا ہو گا کبھی
تیری اپنی دُنیا ہو۔
تیرے اپنے بچے ہوں
ننھے منّے، بھولے بھالے —— جیسے آنکھوں کے دو پیالے
پر میں جانتا ہوں۔
یہ کبھی نہیں ہو گا ——!!!

پشکر کا ہاتھ تھوڑے لمحے کے لئے رُک گیا۔ اُس نے ڈائری کے اس صفحے کو غور سے دیکھا اور آگے لکھنے لگا۔

"...... میری شادی زوبی سے نہیں ہو سکتی۔ اس لئے نہیں کہ زوبی نے شادی کرنے سے انکار کیا ہو۔ بلکہ اس لئے کہ ہم دونوں ایک ہی مٹی سے پھوٹے ہوئے دو ایسے پودے ہیں۔ جنہیں مذہبی روایات ایک دوسرے کی جانب جھکنے پر پابندی عائد کرتی ہیں —— اور گاؤں والے اپنے مذہب کا نیلام ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ عجیب ہیں یہ گاؤں کے لوگ بھی، کاش جانے سے پہلے میں ایک بار زوبی سے مل سکتا۔ کاش ایک بار مجھے اُس کے دل کی بات معلوم ہوتی —— لیکن کیا کروں! زوبی کا بوڑھا باپ راستے کا پتھر ہے۔ جسے اگر میں چاہوں تو ایک معمولی ٹھوکر سے ہٹا سکتا ہوں مگر زوبی مجھ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو گی کیا؟! تپ دق کے ایک مریض کے ساتھ وہ شادی کیوں کرنے لگی؟! اور کہتے ہیں جسے تپ دق کا مرض ہوتا ہے وہ مر ہی جاتا ہے!! اور کیا واقعی میں نے اُس سے شادی کی خواہش کی ہے۔ بس تو صرف دل سے یہ چاہتا ہوں کہ زوبی میری نگاہوں کے سامنے رہے۔ میری آخری سانس اُس کی رُندھی ہوئی خاموش لَے کے سامنے ٹوٹے۔ بس! کتنی چھوٹی سی تمنا ہے۔ لیکن گاؤں کے لوگ بھی تو سمجھتے ہیں بچارے ——!

آج گاؤں والوں نے مجھ سے کہا کہ میں صبح سویرے تک اس

گاؤں سے چلا جاؤں۔ نہیں تو میرے لئے بُرا ہوگا۔ سُنا ہے بوڑھے نے زوبی کو کوٹھری میں بند کر دیا ہے ——— وحشی ہیں یہ لوگ ———!

صبح سویرے میرے شہر جانے کے لئے بیل گاڑی آئے گی ——— آج گاؤں میں میری زندگی کی آخری رات ہے۔ میری موت کی آخری صبح ہے!"

اتنا لکھ کر پُشکر کا ہاتھ رک گیا۔ اُس نے کچھ لکھنا چاہا مگر لکھ نہ سکا۔ آج کا دن اِس کی زندگی کا سب سے اچھوتا دن تھا۔ نہ جانے کل کیا ہوگا ———؟ اور پُشکر کل کے متعلق سوچنا گناہ سمجھتا تھا۔ زندگی کا جو رُخ اُس کے سامنے آتا۔ وہ اسی رُخ کے متعلق سوچنے کا عادی تھا۔ ماضی کو وہ بھول چکا تھا۔ حال کا وہ غلام نہیں تھا۔ اور مستقبل سے وہ ہمیشہ بے پروائی برتنے کا قائل تھا ———"

مگر آج نہ اس کے ساتھ ماضی تھا، نہ حال، نہ ہی مستقبل۔ اس کی ساری زندگی جیسے صرف چار دنوں تک محدود تھی۔ اس کے ذہن میں صرف چار دنوں کا وجود تھا۔ یہ چار دن اس کی بیمار زندگی پر سب سے انوکھا نقش چھوڑ گئے تھے ۔ ۔ ۔ ——— اور آج گاؤں میں اس کا جو تھا دن تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ گاؤں میں چار دنوں سے نہیں، چار جنموں سے رہتا آیا ہو۔ یہ سوچ کر اسے انتہائی کوفت ہو رہی تھی۔ کہ وہ اس گاؤں کو پَو پھٹنے سے پہلے چھوڑ کر چلا جائے گا ——— گاؤں والوں کو کتنی خوشی

ہوگی، وہ جانتا تھا۔ سارے گاؤں میں ایک ہی وجود ہے جو کل روز کی طرح روئے گا ــــــ کل اس کے رونے میں تڑپ ہوگی، زیادہ درد ہوگا۔ لیکن کون دیکھے گا۔ کون سُنے گا!؟

کل وہ نیلے آنکھوں والی، سرخ بالوں والی وہ خاموش لڑکی روز سے زیادہ روئے گی۔ اس کی آواز چنار کے پتوں میں دب کر رہ جائے گی۔ ــــــ وہ روئے گی اور سب اس کا رونا سن لیں گے۔ لیکن وہ کچھ بھی نہ کہیں گے۔ ان کے لئے تو وہ معمولی سی بات ہے۔ بالکل معمولی جیسے کسی غریب انسان کی قوت .....

پُشکر نے ڈائری کو ٹیبل پر رکھا۔ اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ چاندنی وہی تھی ــــ چنار کے درخت وہی تھے، چنار کے درختوں کے بیچ میں پڑا ہوا پتھر وہی تھا۔ بے جان اور خاموش پتھر ــــــ آج سے صرف چار دن پہلے اس پتھر میں جان تھی ــــــ صرف زدنی کے بیٹھنے سے!

اس نے کھڑکی بند کرلی۔ ٹیبل سے ڈائری اٹھائی اور آج سے چار دن پہلے کا ورق الٹ دیا۔

''گاؤں میں آج میرا پہلا دن ہے!

آج میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے اس گاؤں میں بہت پہلے چلا آنا چاہئے تھا۔ میں ڈیڈی سے ہمیشہ اس بات پر لڑتا رہا کہ اس گاؤں میں رکھا ہی کیا ہے۔ اگر مجھے اچھا ہونا ہوگا۔ شہر ہی میں ہوں گا۔ ڈیڈی میری باتیں

سُن کر خاموش ہو جاتے - پھر بڑے بھیّا نے ایک دن کہا ———

"پُوشی، اگر تم حُسن کے دلدادہ ہو تو گاؤں چلے جاؤ ——— !"

اُس دن میں کس بے باکی سے ہنسا تھا، تپِ دق کا مریض اور حُسن کا دلدادہ ؟!

اگر میری صحت اتنی نہ گر جاتی تو میں یہاں چلا ہی کیوں آتا - اور اب میں جو یہاں آیا ہوں تو سوچ رہا ہوں، مجھے بہت پہلے یہاں آنا چاہیئے تھا -

کتنی صاف ستھری جگہ ہے یہ ——— لوگ کتنے معصوم ہیں - لڑکیاں الھڑ اور بے باک! نہ وہ شہری رنگ ہے اور نہ شان، لیکن پھر بھی یہاں زندگی ہے - زندہ اور امر! اپنے یہاں کی زندگی سِسک سِسک کر دم توڑ رہی ہے - رنگ ہے تو وہ نقلی، شان ہے تو وہ مصنوعی، لوگوں کی محبت ہے تو وہ دکھاوے کی ——— یہاں سب کچھ عجیب ہے، نرالا، اچھوتا اور مختلف!

گاؤں کا چودھری رامو کاکا کس شان سے میرے پاس آکر کہنے لگا ——— "

صاحب، ہمارے یہاں پرسوں جشن ہو گا - سب لوگ شریک ہوں گے - ہندو لوگ جشن میں شریک ہوں گے - مسلمان تماشا دیکھیں گے آپ آئیں گے نا ؟!"

" بھئی کیا جشن ہو گا ——— ؟" میں نے پوچھا -

"بابو جی ۔ جوالا مکھی کا مندر ہے نا...... وہاں دن بھر لوگ آتے رہیں گے۔ رات کو دیوی کا جشن ہو گا۔ عورتیں ناچیں گی اور مرد ڈھول بجائیں گے۔"

میں نے چودھری سے وعدہ کیا کہ میں ضرور اُس جشن میں آؤں گا!
اِس گاؤں کی راتیں کتنی سہانی اور دلفریب ہوتی ہیں۔ آج کی رات میری زندگی کی سب سے حسین رات ہے۔ کیا معلوم کل کی رات آج کی رات سے بھی زیادہ حسین ہو۔ شہر میں رہ کر ہم لوگ روس اور امریکہ کے چاند تک پہنچنے کے منصوبوں پر غور کرتے ہیں۔ لیکن آج میں سوچ رہا ہوں ہم بے وقوف ہیں۔ چاند تو "پُوجنے کی چیز ہے اور جس چیز کو پُوجا جاتا ہے، اُس کا درجہ ہم سے بڑا ہوتا ہے۔ اُسے صرف دیکھا جاتا ہے، چھُوا نہیں جاتا۔ لیکن ہم ہیں کہ خوبصورتی کو مسلنے کی جُستجو میں مبتلا رہتے ہیں۔

چاندنی کے ٹھنڈے دُھوپ کو چیرتے، ہوتے پگڈنڈیوں کو پھلانگتے ہوئے آج میں نے سارے گاؤں کا چکر لگایا۔ دھان کے کھیتوں کو جب پہاڑی پگڈنڈیوں سے گزرتے ہوئے آدمی دیکھتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کھردری زمین پر مخمل کا فرش بچھا یا گیا ہو۔ رات گئے تک میں گھومتا رہا۔ میں دھرتی کی چھاتی سے لگ کر سو جانا چاہتا ہوں۔ میرا پیار، میری چاہت یہ دھرتی ہے۔ میرے جلتے سینے پر یہی ٹھنڈا مرہم رکھ سکتی ہے۔

رات کے تقریباً ایک بجے جب سارے گاؤں میں خاموشی تھی۔ موت جیسا بھیانک سکوت تھا، تو میں سسکیوں کی آواز سن کر چونک پڑا۔ اتنی رات گئے کون رو رہا ہے؟ میں سوچنے لگا۔ کہیں میں چلتے چلتے سپنا تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟ لیکن جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا آواز صاف ہوتی گئی۔ بڑے کھیت کو پار کر کے چناروں کا جھنڈ نظر آنے لگا۔ میں آگے بڑھا۔ میری حیرانی کی حد نہیں رہی ـــــــ ایک لڑکی زانو میں سر دبائے رو رہی تھی۔ اُس کے سر سے دوپٹہ لڑھک کر نیچے گر گیا تھا!

سُرخ بالوں والی یہ لڑکی نہ جانے کیوں رو رہی تھی۔ میں زور سے کھانسا۔ بالوں کے لٹ میں حرکت ہوئی۔ سر میں ہلکی سی جنبش ہوئی اور دو موٹی موٹی آنکھیں مجھے گھورنے لگیں۔

"تم کیوں رو رہی ہو ـــــــ ؟"!

وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔ وہ کسی قدیم یونانی آرٹسٹ کا شاہکار مجسمہ تھی اور نہ ہی کسی برفانی پری کا عکسِ جمیل ـــــــ پھر بھی اُس کے حُسن میں ایک خاص انفرادیت تھی۔ اُس کی آنکھیں کسی جنگلی جھیل کی طرح نیلی تھیں۔ اُس کے بال سُرخ تھے جیسے سونے کے ملائم تار!

"اے سُرخ بالوں، نیلی آنکھوں والی لڑکی ـــــــ تمھیں کس کا انتظار ہے؟" ـــــــ میں نے اپنے من ہی من میں کہا ـــــــ اُس نے

اپنی رُندھی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور تیز تیز قدموں سے وہاں سے چل دی۔

نہ معلوم وہ کیوں رو رہی تھی۔ اُسے کس کا غم تھا ـــــ ؟! کاش میں اُس کے غم میں شریک ہو سکتا۔ کل جب چودھری آئے گا میں پوچھ لوں گا۔ آخر وہ کون تھی ؟!

یہ خوبصورت پہاڑی پھول، یہ حسین پہاڑی چاندنی، یہ لطیف پہاڑی ہوائیں، کیوں روتی ہیں۔ کس کی جستجو میں روتی ہیں۔ کون ہے وہ۔ کہاں ہے وہ ؟! ـــــ ان ادھوری کہانیوں کی کب تکمیل ہوگی۔ یہ اُجڑی داستانیں کب آباد ہوں گی۔ ان بچھڑی ہوئی روحوں کا کب ملاپ ہوگا۔ کاش کہ میرے ہاتھ لمبے ہوتے، میری آواز اتنی اونچی ہوتی کہ پہاڑوں کو پھلانگ کر دُنیا کے خالق تک پہنچ سکتی ـــــ اے میرے پروردگار ـــــ !!!

پُشکرنے ڈائری کا یہ صفحہ پڑھ کر ایک ٹھنڈی سانس لی اور ڈائری کا ایک اور ورق اُلٹ دیا!

" آج گاؤں میں میرا دوسرا دن ہے ـــــ اس وقت رات کے ٹھیک تین بجے ہیں۔ اور میں آج کا صفحہ لکھ رہا ہوں!

شہر میں جو کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ وہ کسی حد تک دُور ہو گئی ہے۔ جو دوا کھر بو گاؤں کے آب و ہوا میں ہے وہ شہر کے ڈاکٹروں کے ہاں کہاں ـــ

دن بھر چودھری کا انتظار کرتا رہا - اپنے ماضی کی کہانی پڑھتا رہا - خوبصورت کہانی تھی - پھر اُس میں ایسا موڑ کیوں ؟! یہ روگ کیوں ؟ !! یہ سوگ کیوں ؟ !!! میرا دماغ آج دن بھر بیکار سا کیوں رہا - میں دن بھر اُسی پُر اسرار لڑکی کے متعلق کیوں سوچتا رہا - چودھری کافی دیر سے آیا -

رات کو جب میں کھانا کھا رہا تھا - چودھری آیا - کل مندر کے سامنے ناچ ہے نا ، اُسی سلسلے میں وہ مصروف تھا ، آتے ہی اُس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ کل میں ناچ دیکھنے ضرور آؤں !

" اور سنو ، چودھری ، کل رات میں دیر تک گھومتا رہا ——— !"

" بابو جی یہاں جو بھی آتا ہے ، کھو جاتا ہے - آپ کو بھی یہ جگہ اچھی لگی نا ؟ ! "

" ارے تم اچھی کہہ رہے ہو ، یہ تو جنت ہے جنت ——— " چودھری خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا -

" سنو چودھری ——— وہ چنار کے درخت ہیں نا - چنار کے درخت ؟ !

" جی ہاں ہیں تو ——— "

" کل رات وہاں ایک لڑکی رو رہی تھی ——— " وہ چونک پڑا ! -

" لڑکی ——— ؟ ! ارے آپ نے اُسے دیکھا کیا - بابو جی رات کو

وہاں مت جایا کیجئے - زوٹی پر تو بھوتوں کا سایہ ہے - وہ منحوس ہے منحوس - بابو جی کہتے ہیں ہر رات وہاں بھوت آتے ہیں - اُسے عذاب میں مبتلا کرتے ہیں اور وہ . . . . . "

" رو دیتی ہے — " میں نے جملہ پورا کیا —

" مگر چودھری یہ تو بکواس ہے ! "

" بابو جی ، سچ کہتا ہوں - دن بھر وہ اچھی خاصی رہتی ہے - گھر کا کام کرتی ہے - لیکن رات کو اُس پر بھوتوں کا قہر نازل ہوتا ہے - اور وہ عذاب کی شدت سے رو دیتی ہے - اُس پر بھوت کوڑے برساتے ہیں - کوڑے — جی ہاں بابو جی ! "

میں نے کہا — " بھوت نہیں ہوں گے ، چودھری - دیوتا ہوں گے ، فرشتے ہوں گے - شیطان اور فرشتے میں صرف اتنا ہی فرق ہے - "

چودھری اپنی بات سناتا رہا - میں سنتا رہا - یہ کہانی مجھے قدیم مصر کی کہانی سی معلوم ہوئی - جب فرعون کے زمانے میں دیوتاؤں کا قہر ہرماسس پر نازل ہوا تھا اور دیوتا آپولس اُس کے زخم کو گناہوں سے پاک کرنے کے لئے آتشیں کوڑے برساتے تھے تاکہ اُس کے جسم میں پاک روح حلول کر جائے اور وہ معصوم بچے کی طرح پاک ہو جائے اور دیوتا ازہرس کے ساتھ بیٹھنے کا رتبہ حاصل کرے -

میں رات کو دیر تک چاند نکلنے کا انتظار کرتا رہا - چاند نکل آیا اور

میں پگڈنڈیوں کو پار کر کے چناروں کے جھنڈ میں جا پہنچا۔ رات کی پُر اسرار خاموشی میں کل کی طرح آج بھی موت کا سا مقدس سکوت چھایا ہوا تھا۔ چنار کے جھنڈ میں کل کی طرح وہی جانا پہچانا پتھر کھڑا تھا۔ کہتے ہیں خاموش پتھر ایمان کی نشانی ہوتی ہے۔ لیکن مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے یہ پتھر پتھر نہیں، ایک بھیانک دلدل ہے۔ جس میں کسی کی روح دھنس گئی ہو۔ رات گئے تک میں لڑکی کا انتظار کرتا رہا۔ آج میں اُس سے یہ پوچھنا چاہتا تھا آخر وہ ہے کون ؟! روتی کیوں ہے ؟!!

ایک بج گیا ——— وہ نہیں آئی!
دو بج گئے ——— وہ نہیں آئی!!

میں بے چین سا ہو گیا اور ریسٹ ہاؤس میں چلا آیا۔ جب میں کھڑکی بند کرنے لگا، دُور چنار کے سایوں میں مجھے کسی جاندار کا سر دکھائی دیا۔ میں جلدی سے باہر نکل آیا اور وہاں پہنچ گیا ———!

وہ رو رہی تھی!!

مجھے ایسا لگا جیسے چاندنی رو رہی ہو!
جیسے ساری کائنات رو رہی ہو!

"لڑکی تم کیوں رو رہی ہو۔" میں نے آہستہ سے اپنا پرانا سوال دُہرایا۔

اُس کی نیلی آنکھیں میری طرف اُٹھ کر رہ گئیں۔ مجھے ایسا محسوس

ہوا جیسے وہ چاندنی کے کفن میں لپٹی ہوئی ہو۔ آج اس نے آنکھوں میں کاجل لگا رکھا تھا اور یہ امتزاج ایسا تھا جیسے وسیع نیلے آسمان کو چاروں طرف سیاہ اَبر نے گھیر لیا ہو۔

"لڑکی تم کیوں رو رہی ہو ——"

اُس کے ہاتھوں میں حرکت ہوئی اُنگلی سے اُس نے نرم و نازک مٹی پر کچھ لکھ دیا۔ میری حیرانی میں اضافہ ہوتا گیا۔ آخر یہ مُنہ سے کیوں نہیں بولتی۔ اُس نے لکھا ——— "تم ایک بدنصیب لڑکی کے پیچھے کیوں آ رہے ہو ——"

میں نے آہستہ سے کہا —— "اس لئے کہ میں خود بھی بدنصیب ہوں۔ تمہاری طرح دُکھی ہوں۔ مجھے اپنا درد بتاؤ ———"

اُس نے زمین پر پھر لکھ دیا ——— "میں منحوس ہوں۔ اس دھرتی پر بوجھ ہوں۔ خدا کے لئے چلے جاؤ۔ میرے بارے میں سوچنا چھوڑ دو ——— جاؤ!"

"مگر تم مُنہ سے کچھ تو بولو؟"

"میں گونگی ہوں ——" اُس نے لکھ دیا اور جلدی سے کپڑے سمیٹ کر وہاں سے چل دی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری دِق زدہ زندگی موت کی آہنی گرفت میں آگئی ہو۔ یہ لڑکی گونگی ہے —— گونگی —— بے زبان، یہ بول نہیں سکتی۔ میرے معبود یہ کیا ظلم ہے۔ یہ کون سا کرشمہ ہے۔

ریسٹ ہاؤس آکر میں دیر تک سوچتا رہا۔ مجھے بالکل نیند نہ آئی۔

شنکر نے ڈائری کا ایک اور ورق اُلٹ دیا۔

"آج گاؤں میں میرا تیسرا دن ہے۔ آج میں کافی تھک گیا ہوں۔ یہ دن ہی ایسا تھا کہ میں کچھ نہ کر سکا۔ دن کو بارہ بجے تک بستر پر پڑا رہا۔ آج خلافِ معمول سویرے سویرے بخار کا حملہ ہوا۔ سر میں شدید درد تھا۔ میں نے تپتی ہوئی زمین کو دیکھ کر باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ دن بھر بیٹھا اس لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا آخر وہ منحوس کیوں ہے!

شام کو گاؤں کا چودھری آیا۔ وہ گاؤں کے جشن میں میری شرکت پر اصرار کرتا رہا۔ میں نے بیماری کا بہانہ کیا وہ نہ مانا اور مجھے اُس کے ساتھ جانا پڑا۔

وہاں مجھے ایک اونچے منڈپ پر بٹھایا گیا۔ تحصیلدار، تھانیدار اور پٹواری وغیرہ سب وہیں بیٹھے ہوئے تھے۔ آج گاؤں کے ہندو بسنتی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ عورتیں لمبے لمبے فرن پہنے ہوئے تھیں۔ اُن کے لمبے دوپٹے کمر کے گرد کمربند کی طرح بندھے ہوئے تھے۔ وہ ایک دائرے میں کھڑی تھیں۔ مردوں کے ہاتھوں میں ڈھول تھے۔ گاؤں کے دوسرے مسلمان اور سکھ وغیرہ بھی منڈپ کے قریب ہی بیٹھے تماشا دیکھنے میں محو تھے۔

دفعتاً جوالا مکھی مندر کی گھنٹی زور زور سے بجنے لگی۔ سب

ہندو مرد اور عورتیں مندر کی طرف مُنھ کر کے دو زانو ہو گئے۔ جب گھنٹی بجنی بند ہوئی تو دیوی کی خوشنودی کا ناچ شروع ہوا۔ عورتیں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اُچھل رہی تھیں۔ مردوں کے ہاتھ تیزی سے ڈھولوں پر پڑ رہے تھے۔

ناچ اپنے جوبن پر تھا۔ میں تحصیلدار کے قریب بیٹھا ناچ کی تعریف کر رہا تھا ـــــ دفعتاً ناچنے والے دھیمے پڑ گئے!

کسی نے چیخ کر کہا ـــــ "زونی ـــ زونی، تم یہاں کہاں، کیوں آئی ہو یہاں؟"

میں نے سامنے کی طرف دیکھا، وہی گونگی لڑکی ناچنے والوں کے درمیاں کھڑی تھی۔ سب مرد اور عورتوں نے اُسے گھیر رکھا تھا۔

"یہ منحوس ہے، منحوس ـــــ" ایک آواز سنائی دی۔

"سارے گاؤں پر نحوست کا سایہ پڑے گا!"

"دیوی ناراض ہو گی۔"

اور پھر سب زونی کو دھکیلنے لگے۔ وہ خاموش چوپائے کی طرح اُن کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ اُس کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو تھے ـــــ وہ آہستہ آہستہ چلنے لگی!

"ٹھہرو ـــ" میں زور سے چیخا ـــــ زونی نے میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں مجھے اُمید کی ایک ہلکی سی کرن دکھائی دی۔

"بابو جی —" گاؤں کا چودھری مجھ سے بولا — "یہ منحوس ہے، اس منحوس کو جشن سے دُور ہی رکھئے۔ آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟! دیوی ناراض ہو گی۔ ہم پر قہر نازل ہو گا۔ فصلیں برباد ہوں گی —"

"بکواس ہے۔" میں نے کہا — "یہ گونگی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ منحوس ہے!"

"بابو جی —" ایک آدمی بولا — "یہ منحوس نہیں تو اور کیا ہے۔ اس کی ماں اس کے پیدا ہوتے ہی مر گئی۔ جس عورت نے اسے دودھ دینا چاہا، اُس کا اپنا بچہ مر گیا اور پھر جب اس کی شادی ایک نوجوان سے طے ہوئی تو شادی سے پہلے ہی اُسے جنگل میں سانپ نے ڈس لیا اور وہ مر گیا۔ یہ منحوس ہے۔ رات رات بھر گلیوں کے چکر لگایا کرتی ہے۔ بھوت اس پر کوڑے برساتے ہیں۔ یہ سسکتی رہتی ہے —"

"گمردھاری — تم بکواس کر رہے ہو —" ایک آدمی چیخا۔ "تم لوگوں نے میری بیٹی کو پاگل بنا دیا ہے۔ آج تک میں تم لوگوں کے دباؤ میں آتا رہا۔ خاموش رہا۔ مگر آج مجھے بولنے دو۔ یہ سب تم لوگوں کی مہربانی ہے — بابو جی! اس کی ماں اس کے پیدا ہوتے ہی مر گئی۔ اس لئے کہ وہ سالہا سال سے بیمار تھی۔ جس عورت نے اسے دودھ دینا چاہا، اُس کا اپنا بچہ مر گیا، اس لئے کہ اُن دنوں گاؤں میں چیچک کی بیماری پھیلی ہوئی تھی۔ سینکڑوں بچے اُس بیماری کا شکار ہوئے — بابو جی! شادی

سے پہلے ہی میری بچی بیوہ ہو گئی ۔ اس لئے کہ سانپ نے جنگل میں اس کے سہاگ کو ڈس لیا۔ یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں۔ اِس معصوم نے اسکول جاکر پڑھنا چاہا تو اِن لوگوں نے اپنے بچوں کو اسکول سے اُٹھالیا۔ مجبوراً اِسے سکول بھی چھوڑنا پڑا ـــــ اس میں نحوست کا کیا سوال! ہاں اِس لڑکی کی تقدیر ضرور چھوٹی ہے ۔ یہ دُنیا کی سب سے بدنصیب عورت ہے ـــــ!" یہ کہہ کر بوڑھا زور سے رونے لگا!

" تم اِس کی شادی کیوں نہیں کرتے ؟!"

" کیا کروں، بابو جی ۔ جہاں کوئی اچھا لڑکا ملتا ہے تو گاؤں والے روک لیتے ہیں، جو بھی تیار ہوتا ہے وہ پیسے مانگتا ہے، میں غریب ہوں۔ کہاں سے لاؤں یہ سب کچھ!

" بکواس بند کرو، بوڑھے ـــ " گردھاری بول اُٹھا۔

میرا ہاتھ ہوا میں بلند ہوا، ہوا میں ہی رُک گیا۔ رُندھی ہوئی آواز میرے سینے سے پھوٹی۔

" تم لوگ ظالم ہو، تم ایک بے گناہ، پاک اور بے زبان لڑکی کے جذبات سے کھیل رہے ہو۔ تم نے جیتے جی اسے موت کے مُنہ میں دھکیل دیا ہے ۔"

" بابو جی ـــــ " کوئی اور بولنے لگا ـــ " اگر آپ میں اتنی ہمت ہے تو کر لیجئے نا زندنی سے شادی!"

" مگر یہ تو ہندو ہے ـــ " کوئی دراز ریش بزرگ چیخ

اُٹھے!

"میرے سامنے مذہب کی کوئی وقعت نہیں۔ یہ ایک فرسودہ اور ٹوٹی ہوئی زنجیر ہے۔ جو صرف جاہلوں کے گلے میں لٹکتی رہتی ہے۔"

"آپ تو ماسٹر جی کی طرح سبق پڑھا رہے ہیں۔" کوئی اور بولا۔

—"تو کر لیجئے نا شادی؟!"

"میں تیار ہوں۔ مگر ایک بات کہہ دوں، میں ایک خطرناک بیماری میں مبتلا ہوں۔ تپ دق میں نہیں چاہتا کہ ایک اچھی بھلی لڑکی کی زندگی برباد ہو جائے۔"

"جھوٹ ہے۔ جھوٹ ہے۔!"

"میں جھوٹ نہیں بولتا — تمہاری اس قہر نازل کرنے والی دیوی کے سامنے کہہ رہا ہوں۔"

گاؤں والوں میں سرگوشی ہونے لگی۔ زونی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ حیرت سے اس کا باپ آگے بڑھا اور بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر جانے لگا۔

"زونی — زونی۔ ادھر آؤ!!" میں پکارتا رہ گیا۔ اس کا باپ اُسے کھینچ کر لے گیا۔ گاؤں والے ہنس رہے تھے!

پشکر نے ایک اور ورق الٹ دیا۔ وہاں آج کے دن یعنی چوتھے دن کی بات تھی۔ وہ چاہتا تو اس میں اور کچھ لکھ دیتا۔ مگر اس کا ذہن اب مضمحل سا ہو گیا تھا۔ اُس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ پتھر اب بھی

خاموش تھا۔ نہ کل رات وہاں زونی گئی اور نہ شاید آج رات۔

دن بھر وہ زونی کا انتظار کرتا رہا۔ وہ نہ آئی۔ اُسے معلوم ہوا تھا کہ زونی کو اُس کے باپ نے کوٹھری میں بند کر رکھا ہے۔ اور ہاں صبح سویرے اُسے گاؤں سے چلے جانے کو بھی کہا گیا تھا۔ اُس نے بیل گاڑی کے لئے پہلے ہی کہہ رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کل سویرے گاڑی آئے گی۔ اُس کے دل میں کسک تھی، ایک عجیب سا درد تھا۔ وہ جانتا تھا یہ درد اُس وقت تک رہے گا جب تک وہ زونی سے نہ مل سکے گا!

وہ رات بھر سوچتا رہا!

صبح سویرے بیل گاڑی دروازے پر آ رکی۔ اُس نے اٹیچی کیس گاڑی پر رکھا اور اِدھر اُدھر دیکھا۔

زونی کہیں بھی نہ تھی۔

چنار کے جھنڈ میں پڑا ہوا پتھر خاموش تھا۔

پگڈنڈیاں ویران تھیں۔

اس کا دل اُداس تھا۔

پشکر نے گاڑی والے سے ٹھہرنے کے لئے کہا۔ وہ ایک بار پھر اُس پتھر کے قریب جانا چاہتا تھا۔ وہ چنار کے جھنڈ کے پاس چلا گیا۔ پتھر وہیں تھا۔ چنار کے درخت وہیں تھے، وہی ماحول تھا، بس ایک زونی نہ تھی۔

وہ واپس جانے کے لئے مڑا۔ مگر چونک پڑا۔ زمین پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ پڑھنے لگا۔

"بابوجی ——— میں منحوس ہوں۔ سب یہی کہتے ہیں۔ آپ صرف ایک بار اپنی زبان سے بھی یہی کہہ دیجئے۔ زندگی میں صرف آپ ہی ملے، جنہوں نے مجھے منحوس نہیں سمجھا۔ آخر کیوں؟ میں کمرے سے بھاگ کر آئی ہوں۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ آج آپ جائیں گے۔ نہ جانے مجھے کیوں اس بات کا یقین ہے کہ آپ ایک بار ضرور یہاں آئیں گے۔ بابوجی۔ یہ گاؤں چھوڑکر مت جانا۔ آپ کی بیماری کا علاج اسی گاؤں میں ہے۔ البتہ میں جا رہی ہوں۔ گاؤں کے لوگوں سے ڈر کر نہیں۔ صرف اس لئے کہ آپ پر میری نحوست کا سایہ نہ پڑے۔ خدا کرے کہ آپ اچھے ہو جائیں ——— میں جا رہی ہوں، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش مت کیجئے۔ ہو سکے تو مجھے یاد رکھئے گا۔ اور یہاں لکھتے جایئے۔ آپ نے میرا لکھا ہوا پڑھا ———!"

پشکر نے وہیں پتھر پر بیٹھ کر دھرتی کے آنچل پر اپنے ہاتھ سے لکھا ——— "زونی کہیں جانا نہیں۔ زندہ رہنا، جب تک میں نہ مر جاؤں میری اور تمہاری بے زبان چاہت میں شادی، بیاہ، نکاح کی ضرورت نہیں۔ روحوں کی چاہت ہے۔ ہم دونوں ایک جیسے ہیں۔ تمہاری زبان کو دق ہے میرے جسم کو۔ میں اپنے دق زدہ جسم کو زندہ رکھوں گا، جب تک تمہیں نئی زبان نہ ملے۔ تمہیں تمہاری بے سہارا زندگی کو ساتھی نہ ملے۔

میں لاؤں گا تمہارے لئے اپنی دُنیا سے تمہارا ساتھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرا انتظار کرنا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

پنشکر کو محسوس ہوا جیسے وہ ایک صحت مند انسان ہے اور زندہ رہنے کا تمنائی ہے۔ زندہ رہے گا۔ اُس نے خاموش پتھر کو دیکھا جیسے رو رہا تھا۔ وہ ایک بے زبان کی خوشیوں کے آنسو تھے۔

بیل گاڑی پر بیٹھا وہ دُور تک اپنے ساتھ پتھر کو بھی لڑھکتے دیکھتا رہا۔ جیسے کوئی جاندار ساتھی ہو اور اُسے دُور تک الوداع کہنے چلا آرہا ہو !!

—— ٥ ——